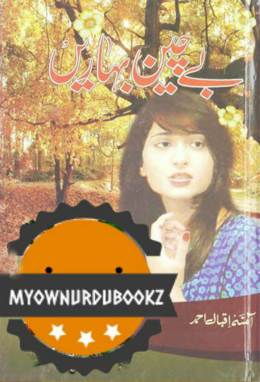
بے چین بہاریں
MYOWNURDUBOOKZ
آمنہ اقبال احمد

بے چین بہاریں

مُصنّفہ

آمنہ اقبال احمد

ارسلان بُک کارپوریشن

اُردو بازار، لاہور

اُس نے دیکھا۔ پانی کی لہریں بے ترتیب ہورہی تھیں۔ ہوا تیز تر ہورہی تھی اور — بوٹ اِدھر اُدھر ڈولنے لگی تھی۔

اُس کا رنگ فق ہوگیا۔ دونوں ہاتھوں سے سختی سے اپنی سیٹ تھام لی۔ پچھتانے لگی کہ صبح ہی صبح سمندر کی سیر کی سر میں کیا سما گئی تھی؟

''کاشف یہیں روک لو''۔ ساحلی علاقے کی آبادی کا پہلا گھر اور اُس کے قریب ہی گلی بوٹ نظر آتے ہی وہ چلائی۔

''باجی گھبرائیں نہیں۔ ایسا تو ہو جاتا ہے کبھی کبھی''۔ کاشف نے بھی اونچی آواز میں کہا کہ —

Pakistanipoint
Waqar Azeem

پانی کے شور کے علاوہ انجن کا اپنا شور بھی کچھ کم نہیں تھا۔

''نہیں۔ادھر ہی روک لو۔میں ایک قدم بھی آگے نہیں جاؤں گی''۔

جبکہ — اُس کا اِرادہ آج دور دور تک جانے کا تھا۔ ہفتہ بھر قبل ہی وہ یہاں مقیم اپنی خالہ کے گھر آئی تھی۔بی اے کے امتحان سے فارغ ہونے کا اُس نے بے چینی سے انتظار کیا تھا۔اور پھر بڑا مسئلہ اُس کے ٹکٹ کا بھی تھا۔وہ ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہاں تک کا ٹکٹ خریدنا اُس کے ابو کے لئے خاصا مشکل تھا۔اُن کی کیمسٹ کی ایک چھوٹی سی دُکان تھی۔جس سے وہ گزر اوقات کررہے تھے۔پھر حال ہی میں انہوں نے اپنا گھر بھی بنایا تھا۔جو جمع پونجی تھی سب اُس میں لگالی تھی۔مگر اب چونکہ وہ اُن کی ایک ہی اولاد رہ گئی تھی۔اُس کی بڑی بہن سال بھر قبل کار حادثے کا شکار ہوگئی تھی۔وہ اُس کے غم میں نڈھال رہتی تھی۔اِس لئے غمزدہ ماں باپ اُسے خوش دیکھنا چاہتے تھے۔اور پھر خالہ اور خالہ زاد بہن بھائی آصفہ اور کاشف کا بے حد اصرار تھا۔آصفہ اُس کی ہم عمر اور کاشف اُس سے چھوٹا تھا۔دونوں نے یہاں کی دنیا کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا۔کہ وہ للچا کر رہ گئی تھی۔اِس کے باوجود اُس نے ابو پر دباؤ نہیں ڈالا تھا بلکہ خود اُنہوں نے ہی اُسے یہاں بھیجنے کا اِرادہ کرلیا تھا۔اُس کی خوشی میں وہ خوش تھے۔کرکرا کے اُنہوں نے اُس کو ریٹرن ٹکٹ مہیا کر ہی دیا تھا۔

نازیہ خالہ کی سسرال عرصہ دراز سے یہیں مقیم تھی۔نازیہ خالہ کو بھی شادی کرا کر یہیں لے آئے تھے۔شروع میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔بعد میں بچے بڑے ہونے لگے۔تو الگ گھر لے لیا تھا۔نواز خالو نے بے انتہا محنت کی تھی۔یہی وجہ تھی کہ آج یورپ کے اِس مہنگے ترین اور حسین ترین sea side شہر Brighton میں آباد تھے۔

دو مرتبہ پہلے بھی وہ آصفہ اور کاشف کے ساتھ سمندر میں بوٹ پر نکلی تھی۔ایکبار کرائے کی بوٹ پر۔اور دوسری دفعہ کاشف کے ایک انگریز دوست کی ذاتی بوٹ پر۔خوب خوب سیر کی تھی۔خوب انجوائے کیا تھا۔

آج پھر وہ اور کاشف، کاشف کے اُسی دوست کی بوٹ میں بیٹھے کھلے سمندر میں رواں دواں تھے۔زیب نے سوچا تھا۔دور تک جائے گی۔پھر پہلے کی طرح صرف سمندر میں ہی چکر کاٹ کر واپس نہیں آئے گی بلکہ جو میں وہیں کہیں ساحل پر بوٹ لگا کر خشکی میں جائے گی۔مخالف سمت کی

جگہیں دیکھے گی۔خاصا وقت گزارے گی۔

وہ چاہتی تھی کہ آصفہ بھی ساتھ جائے مگر وہ کسی طرح جاگ ہی نہیں رہی تھی۔دراصل رات دونوں دیر تک موؤی دیکھتی رہی تھیں۔پھر ویک اینڈ تھا۔آصفہ کی چھٹی بھی تھی۔اِس لئے آصفہ نے معذرت کرلی تھی۔کاشف پر ہی اکتفاء کرنے کو کہہ دیا تھا۔

کاشف بوٹ چلا رہا تھا اور وہ پاس بیٹھی اِرد گرد کے جنتِ نظیر نظاروں لطف اندوز ہورہی تھی۔

پھر — ابھی قریباً پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ کشتی ڈولنے لگی۔اُس نے غور کیا تو پانی کی لہریں بھی اوپر نیچے ہوتی دکھائی دیں۔ساتھ ہی ہوا بھی تیز ہوگئی تھی۔دور تک پانی ہی پانی اور — ایک اکیلی اُن کی بوٹ۔وہ گھبرا ہی تو گئی۔

''مگر۔۔۔کسی اور کی موؤرنگ پر کیسے بوٹ باندھ لوں''۔کاشف نے کہہ ہی دیا کہ —

زیب تو اجنبی تھی یہاں۔مگر وہ تو قاعدے اور قانون جانتا تھا اِس سمندر کنارے واقع شہر کے۔بغیر اجازت یہاں کسی اور کی موؤرنگ پر بوٹ نہیں باندھی جاسکتی تھی۔

اُس نے اِس چھوٹے سے مگر نمایاں خوبصورتی کے حامل اِس گھر کے مکین کے بارے میں تھوڑا بہت سن بھی رکھا تھا۔وہ پاکستانی تھا، بہت بڑا انڈسٹریلسٹ تھا، سنگین خان نام تھا اور گرمیاں گزارنے یہاں آیا کرتا تھا۔۔۔

''باندھو نا''۔ہوا مزید تیز ہوگئی۔کشتی مزید ڈولی۔تو وہ مزید خوفزدہ ہوگئی۔چلا کر بولی۔

''باجی ایسا میں نے پہلے کبھی نہیں کیا نا''۔کاشف سخت تذبذب میں تھا۔

''آج کرلو''۔وہ اور بھی زور سے بولی۔

''کسی نے کچھ کہا تو۔۔۔''

''تم بوٹ باندھ لو۔میں جواب دوں گی اگر کسی نے کچھ کہا تو''۔

وہ تو مارے ڈر کے کانپ رہی تھی۔اور کاشف تھا کہ وقت ضائع کررہا تھا۔

''ٹھیک ہے لیکن۔۔۔پہلے میں دیکھ تو لوں۔کوئی خالی موؤرنگ ہے بھی یا نہیں؟'' وہ قریب آتے گھر کی موؤرنگ پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

’’جلدی کرو کاشف۔ ورنہ یہیں میری جان نکل جائے گی۔‘‘

لہریں واقعی اونچی ہو رہی تھیں۔ مگر ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جس کا زیب کو ڈر تھا۔ اُس کا بھی قصور نہیں تھا۔ سمندر سے پہلے کبھی واسطہ جو نہیں پڑا تھا۔

بہرحال— کاشف نے دیکھا۔ وہیں بوٹ کے اِس طرف ایک اور موورنگ بھی تھی جو خالی پڑی تھی۔

وہ آگے بڑھا۔ کنارے پر اُترنے لگا تو بوٹ زور سے جھک گئی اور سہمی گھبرائی زیب کی چیخ نکل گئی۔

کاشف بوٹ باندھنے لگا اور—

زیب جلدی سے اُتر گئی۔ جان میں جان آئی۔ تو دیکھا ساحل کی ریت سے پرے قدرے اوپر ہریالیوں میں سے نکلتا سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک گارڈ یا پھر ملازم خاص قسم کا آدمی تیزی سے اُن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

’’آپ یہاں بوٹ نہیں باندھ سکتے‘‘۔ وہ کاشف کو دیکھتے ہوئے سختی سے بولا۔

کاشف سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ زیب کی طرف دیکھنے لگا۔

’’اگر کوئی مصیبت میں ہو تو بھی نہیں باندھ سکتا۔‘‘ زیب بڑے ضبط سے بولی۔

’’پانی اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ تو یہ گھبرا گئیں۔‘‘ کاشف جیسے صفائی دینے لگا۔

ملازم نے ایک نظر پانیوں پر ڈالی۔

’’اتنا اوپر نیچے تو عام ہوتا رہتا۔۔۔‘‘

’’میں نے پہلے نہیں دیکھا ایسا ہوتے ہوئے۔‘‘ سامنے دیکھتے ہوئے وہ لاپروائی سے بولی۔

’’آپ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہاں بوٹ نہیں باندھی جاتی؟‘‘ آدمی کاشف کو گھورنے لگا۔

’’ہم نے بوٹ آپ کی بوٹ کے اوپر نہیں باندھی۔ خالی موورنگ پر باندھی ہے۔‘‘ وہ قدرے تیزی سے بولی۔‘‘

’’پھر بھی— بغیر اجازت کے آپ ایسا نہیں کر سکتیں‘‘۔

’’بوٹ چاہے اُلٹ جاتی اجازت لیتے لیتے۔‘‘

’’میڈم! آپ بُرا مت مانیں، لیکن یہ میری ڈیوٹی ہے۔۔۔‘‘

’’تو نبھائیں اپنی ڈیوٹی۔ ہم تو اِدھر ہی رہیں گے۔ جب تک موسم ٹھیک نہیں ہو جاتا۔‘‘ وہ آرام سے وہیں ریت پر بیٹھ گئی۔

’’باجی موسم ٹھیک تو ہے۔ چلیں واپس چلتے ہیں‘‘۔

’’کاشف تم چپ رہو۔ لہریں پہلے سے بہتر ہو رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر چلے جائیں گے۔‘‘

کاشف واقعی چپ ہو گیا۔ آدمی بھی لاجواب سا واپس پلٹ گیا۔

اُس کی retreat پر زیب دھیرے سے مسکرا دی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک نظر اوپر کچھ فاصلے پر سبزے میں گھرے گھر پر ڈالی۔ سمندر کے رُخ کھلتی ایک خوبصورت بالکنی میں سے کوئی شخص جھانکتے جھانکتے واپس پلٹا تھا۔

وہ باقاعدہ ہنس دی۔ وہ شخص بھی شاید اُسکی شور و غوغا سن کر بالکنی میں آیا تھا۔ اور پھر باقی سب کو پُرسکون ہوتے دیکھ کر خود بھی پلٹ گیا تھا پر—

اُس نے اُسکی ایک جھلک ضرور دیکھ لی تھی۔ چونکا دینے والی پرسنیلٹی تھی اُسکی، بلا کا ہینڈسم تھا وہ!

وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی۔ کاشف بھی بیٹھ گیا تھا پھر—

اُس کی دانست میں موسم ٹھیک ہو گیا۔ تو دونوں بوٹ میں بیٹھے اور— واپس چل پڑے۔

کاشف نے اپنے دوست کی موورنگ پر کشتی باندھی۔ اور پھر دونوں ہی گھروں کے بیچوں بیچ شورٹ کٹ لیتے گھر آ گئے۔

’’بڑی جلدی آ گئے واپس۔‘‘ آصفہ کچن میں لگی ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ کرتے کرتے بول پڑی۔

’’ہاں بس۔۔۔‘‘

اور پیچھے پیچھے کاشف بھی پہنچ گیا۔

''ہائے آصفہ باجی کیا بتاؤں۔آج جو زیب باجی نے شرمندہ کرایا ہے۔ وہ بھی اُس پاکستانی millionaire کے گھر کے آگے۔'' کاشف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اور پھر کاشف نے آصفہ کو من وعن سارا واقعہ سنا دیا۔

اور وہ ملینیئر بھی میری واویلا پر اپنی بالکنی میں آ کھڑا ہوا تھا۔'' زیب نے کہا۔

''اچھا؟'' وہ کچھ پریشان اور کچھ متجسس سی بولی

''ہاں۔مگر میرے اُوپر دیکھتے ہی وہ واپس پلٹ گیا''

''چچ چچ۔تو تم دیکھ نہیں پائیں اُسے'' آصفہ نے اُسے چھیڑا۔

''نہیں۔ایک جھلک تو دیکھ ہی لی۔''

''کیسا ہے؟''

کہ آصفہ نے بھی اُس کے بارے میں سن رکھا تھا۔کہ بیچلر تھا، بہت پیسے والا تھا، بہت سٹائلش تھا، اور — شاید بہت قیمتی بھی۔کہ ایک گارڈ برابر اُس کے گھر کے آس پاس، منڈلاتا رہتا تھا!

''بس ٹھیک ہے۔'' لاپروائی سے کہتے ہوئے زیب کپ میں اپنے لیے چائے ڈالنے لگی۔

کاشف اپنے کمرے میں چلا گیا۔کل کے ٹسٹ کی تیاری کرنا تھی۔نازیہ خالہ اور نواز خالو اپنی ایک پاکستانی دوست فیملی سے ملنے جارہے تھے۔آصفہ کی بھی آج یونیورسٹی سے چھٹی تھی۔سو وہ دونوں خود سے اپنا آج کا پروگرام بنانے لگیں۔

یہاں سے کچھ فاصلے پر سندر کنارے واقع ایک بہت ہی مشہور چھوٹا سے پیارا سا گاؤں Rotting Dean تھا۔اُنھوں نے وہیں جانے کا فیصلہ کرلیا۔

دونوں نے جلدی جلدی کچن صاف کیا۔اپنا بیڈروم دُرست کیا۔کپڑے بدلے اور — پیدل چلتیں، شورٹ کٹ کرتیں، گھروں کے پچھواڑے بس سٹینڈ پر آگئیں۔تھوڑی ہی دیر کے انتظار کے بعد مطلوبہ نمبر کی بس آگئی۔وہ اُس میں بیٹھیں۔اور روانہ ہوگئیں۔

یہ قدیم وقتوں کا گاؤں بہت ہی انوکھا بہت ہی خوبصورت تھا۔گزرے وقتوں کے پرانی

طرز کے رنگین مٹی کے لیپ کیئے ہوئے بالکل چھوٹے چھوٹے، نیچی نیچی چھتوں اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے گھر تھے۔بالکل چھوٹی سی پرانے خدوخال کی کیفے تھی اور لازوال انگریزی شاعر Rudyard Kipling کا مشہور زمانہ باغ اور اُسکا بڑا سا بہت خوبصورت گھر تھا!

آصفہ نے اسے خوب خوب گھمایا پھرایا۔تھک ہار کر دونوں وہیں گاؤں کے قریب نیلگوں پانیوں میں جھانکتے ایک چھوٹے سے خوبصورت ریسٹورانٹ میں آگئیں۔

مزے لے لیکر لنچ کھایا اور — بس سٹاپ پر آئیں، بس میں بیٹھتیں ایکبار پھر شہر کی سمت چل پڑیں۔

گھر میں گروسری تقریباً ختم تھی۔کچھ اور بھی چھوٹے موٹے کام تھے۔آصفہ اور زیب سٹی سینٹر میں اتر گئیں۔

مطلوبہ گروسری خریدی۔باقی کام بھی کرلئے۔پھر شوپنگ بیگز ہاتھوں میں لئے باہر آگئیں۔

شوپنگ سینٹر کے احاطے میں ہی چھوٹا سا ریسٹورانٹ تھا۔وہ دونوں اُس میں داخل ہوگئیں۔تیز ہوا اور بلا کی سردی نے دونوں کو بے حال کردیا تھا۔دونوں کو ہی کوفی کی سخت طلب ہو رہی تھی۔دونوں نے کوفی لی اور باہر آتے ہوئے ریسٹورانٹ کی لگی بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ گئیں۔

زیب مزیدار کوفی کے گھونٹ لیتی سامنے دیکھنے لگی۔

معاً — وہ چونکی، وہی ملینیئر قریب کی پارکنگ میں کھڑی ایک لمبی چوڑی سیاہ قیمتی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے اس کی نظر ریسٹورانٹ کے احاطے پر پڑی' پھر زیب پر — اور پھر — وہ سامنے دیکھنے لگا تھا۔

اِس کے باوجود زیب کو لگا وہ اُسے جان گیا تھا۔پہچان گیا تھا!

''وہی آدمی جارہا ہے۔'' گاڑی چل پڑی تو زیب گویا ہوئی۔

آصفہ کی پیٹھ تھی اُس طرف، رخ موڑ کر دیکھا۔گاڑی دھیرے دھیرے نظروں سے

اوجھل ہورہی تھی۔

''بی ایم ڈبلیو۔ وہ بھی latest model ۔۔۔کیا شان ہے؟'' آصفہ رخ موڑتے ہوئے بولی۔

''بہت ہینڈسم ہے ویسے۔'' زیب نے کہا۔

''پھر؟ کیا خیال ہے؟''

''کچھ نہیں۔ اچھی چیز کو اچھا تو کہنا پڑتا ہے۔''

''واہ! کیا بات ہے۔''

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''ویسے۔۔۔تم پر نظر پڑی نا۔ تو بھول جائے گا اپنی ساری سلطنت۔''

وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ گندمی ملیح رنگت پر بڑی بڑی بہت حسین شربتی آنکھیں۔ بے حد پرکشش نقوش، لمبے گھنے ڈارک براؤن بال، لمبا قد، سلم سمارٹ فگر، جیسے بہت فرصت میں قدرت سے شاہکار کیا تھا اُسے!

''غریب پر کسی امیر کی نظر پڑتے سنا تو نہیں''۔

"you are wrong." بڑے بڑے بادشاہوں نے حسنِ غریب کے لئے تاج و تخت کو ٹھکرایا ہے۔۔۔''

''تم اُس زمانے کی بات کررہی ہو۔ جب لوگ genuine تھے۔ دولت کی ہوس نہیں جاگی تھی ابھی۔۔۔''

جب سے وہ سولہ سترہ برس کی ہوئی تھی۔ جہاں جاتی تھی۔ لوگ سراہے بغیر نہیں رہتے تھے۔ پچھلے دو تین سالوں میں اُس کے کئی مالدار گھرانوں سے رشتے آئے۔ مگر — اُن کا گھر بار رہن سہن دیکھ کر مدعا بیان کئے بغیر ہی الٹے قدموں لوٹ گئے۔

جہاں اُسے اُن کی بدحواسی پر ہنسی آئی۔ وہاں اپنی کم مائیگی کا بھی ضرور احساس ہوا۔

''ہاں۔ پاکستان میں یہ چیز بہت بڑھ گئی ہے۔۔۔'' آصفہ کچھ سوچتے سوچتے بولی۔ اُسے سارا پتہ چلتا تو رہتا تھا۔

''صرف پاکستان میں ہی نہیں۔ پورے انڈیا میں اور شاید پوری دنیا میں۔ تمہیں انٹرسٹنگ بات بتاؤں۔۔۔''

دونوں کزنز کوفی بھی پیتی جارہی تھیں۔ اور گپ شپ بھی کرتی جارہی تھیں۔

''ہاں۔'' آصفہ کوفی کا سِپ لیتے ہوئے بولی۔

''ہماری ایلیٹ کلاس کی لڑکیاں آجکل بڑے مزے سے بوائے فرینڈز کے ساتھ ڈیٹس مارتی ہیں۔ انٹرنیٹ اور سیل فونز پر لڑکوں کے ساتھ ایسی ایسی باتیں کرتی ہیں کہ تم سنو۔ تو یورپ تو کیا امریکہ کو بھی بُھول جاؤ۔''

''وہ کہتے ہیں نا کہ۔۔۔ بند پرندہ کھل جائے تو وہ اُڑ اُڑ کر خود کو لہولہان کردیتا ہے۔''

''بس یہی حال ہے پاکستان میں ہماری ایلیٹ کلاس کا۔''

''چلو۔ کسی کام میں تو ترقی کررہا ہے۔'' آصفہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''لیکن اِس سے بھی دلچسپ بات ایک اور ہے۔ مالدار ماؤں کو اِن لڑکیوں کے کرتوت کا پتہ ہوتا ہے پھر بھی اپنے بیٹوں کے لئے رشتے لینے انہی کے گھر جاتی ہیں۔۔۔''

''جبھی تو طلاق ریٹ بڑھ گئی ہے پاکستان میں۔'' آصفہ نے کہا۔ ''اپنی دولت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکیاں اتنی ایڈوانس ہورہی ہیں۔ کہ مردوں کو خاطر میں ہی نہیں لاتیں۔۔۔''

''ہاں نانی اماں۔ تم سچ کہہ رہی ہو''۔ زیب بہت سنجیدگی سے بولی۔

اور — آصفہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

چار بج رہے تھے۔ دونوں ڈسپوزیبل کپس ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے شوپنگ سینٹر کے احاطے سے باہر آ گئیں۔ کچھ آگے چل کر بس سٹاپ پر آئیں۔ اور مطلوبہ بس میں بیٹھ کر گھر آ گئیں۔

آج سب اکٹھے 'The Royal Pavilion' دیکھنے گئے تھے۔ نازیہ خالہ اور فیملی تو پہلے بھی دیکھ چکے تھے کنگ جورج فورتھ کا بنوایا ہوا یہ breath taking محل۔ مگر زیب پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ باہر سے مسلم گنبدوں اور اندر سے چینی طرز پر بنا یہ شاہکار باہر سے آنے والوں کو تو کیا یہاں کے لوکلز کو بھی انگشت بدنداں کر دیتا تھا۔

کنگ جورج فورتھ کے بعد اِس میں کوئین وکٹوریہ رہی۔ اور 1850 میں اُس نے Royal Pavilion برائیٹن کو بیچ دیا۔

اِس طرح سے محل کی حفاظت کی ذمہ داری کراؤن سے ٹاؤن کو منتقل کر دی گئی۔

ٹکٹ لے کر وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔

یہاں لمبی راہداری تھی۔ کچھ لوگ دائیں اور کچھ بائیں مڑ رہے تھے۔

''زیب بیٹا پہلے تمہیں کنگ کا کچن دِکھاتے ہیں''۔ نازیہ خالہ بولیں۔

اور بے شمار ٹورسٹس اور لوکلز کے ساتھ وہ لوگ دائیں مڑ گئے۔

کنگ کا کچن دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئی۔ بہت بڑا کچن تھا۔ سامنے پوری دیوار کے ساتھ بنے چولہے اور grill تھے۔ وہیں گرل پر لٹکتے کٹے ہوئے دنبے تھے۔ بھوننے کے لئے بڑی بڑی بطخیں تھیں۔ لمبی لمبی میزوں پر شکار کئے گئے ہرن، ڈھیریوں میں رکھے مختلف قسم کے پرندے تھے۔ اس کے علاوہ پکانے کے لئے انواع واقسام کی چیزیں تھیں۔ دیواروں کے شیلفوں میں لگے کھانا پکانے کے اَن گنت چمکتے برتن تھے۔ لگتا تھا ابھی کوئی آئے گا اور کھانا پکانا شروع ہو جائے گا۔

ایک کوریئر کی بھی آواز آ رہی تھی۔ جو بتا رہی تھی کہ کنگ عمدہ کھانا کھانے کا شوقین تھا۔ اور ایک ہی وقت میں ساٹھ سے سو تک ڈشز کھانے کی میز پر سرو ہوتی تھیں۔ کنگ کا وزن 245 پاؤنڈز تھا!

وہاں سے وہ لوگ قریبی کمرے میں پلٹے۔ کچن سے کھانا ڈشز میں ڈال کر یہاں ایک بہت بڑی میز پر منتقل کر دیا جاتا تھا اور یہاں سے اگلے بہت بڑے ڈائننگ ہال میں میز پر لگا دیا جاتا تھا۔

ڈائننگ ہال کے در و دیوار دیدنی تھے۔ ایک بے حد لمبی چوڑی ٹیبل کے گرد اَن گنت خوبصورت کرسیاں لگی تھیں۔ اور ٹیبل پر سجے سونے کے ملمعے والے دیدہ زیب برتن چالیس فٹ اونچی چھت سے لٹکتے بہت نفیس بھاری بھرکم فانوس کی روشنی میں دمکتے نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ سجی سجائی میز کرسیاں اور میز کے پرلے سرے کی اُدھ کھسکی شاہ کی مخصوص کرسی دیکھ کر بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی شاہ کھانا تناول فرما کر اپنی سیٹ سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ عجیب جیتا جاگتا سا ماحول تھا کمرے کا!

وہاں سے وہ لوگ غلام گردش میں سے ہوتے ہوئے دیوان خانے میں آ گئے۔ یہاں شاہ کے مہمان بیٹھتے تھے۔ دائیں جانب وسیع و عریض کھڑکی کے دونوں طرف فرش سے لے کر اوپر تک آئینے لگے تھے۔ جس میں اندر داخل ہوتے ہوئے Knights اپنے شوز سے لیکر ٹائیٹس تک کا،

دوسرے لفظوں میں اپنی سمارٹنیس کا جائزہ لیتے تھے۔ خوبصورت آتش دان کے قریب ایک نازک سا گلکاری کا چھوٹا سا سکرین ایستادہ تھا۔ وہاں خوشنما کرسی پر بیٹھتی مہمان خاتون اس سکرین کے ذریعے اپنے چہرے کے میک اپ کو آگ کی تپش سے خراب ہونے سے بچاتی تھی۔

مزید آگے سونے کے پتر چڑھی چھت والا میوزک روم تھا۔ یہاں بھی چھت سے بہت سے کنولوں سے سجا شینڈ لیئر لٹک رہا تھا۔

اب وہ لوگ بمعہ اور ٹورنٹس کے سیڑھیاں چڑھتے اوپر آنے لگے۔

خالہ، خالو، کاشف اور آصفہ آگے آگے تھے۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ کہ لائین میں جانا پڑتا تھا۔ پھیل کر نہیں۔

تبھی۔ ڈھیلی ڈھالی لمبی سی چٹیا میں گندھے اُس کے بال زور سے کھچ گئے۔ مڑ کر دیکھا۔

وہی آدمی تھا۔ سنگین خان۔ اُس کے بال اُس کے کوٹ کے بٹن میں الجھ گئے تھے۔

ایک پل کو اُسکی نظریں زیب کی طرف اٹھیں۔ اور پھر— وہ اپنے بٹن سے اُس کے بال الگ کرنے لگا۔

اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کسی مشین کی طرح کسی بھی جذبے سے عاری وہ احتیاط سے اپنا بٹن اُس کے بالوں سے چھڑا رہا تھا۔

زیب نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ کہیں نازیہ خالہ وغیرہ دیکھ تو نہیں رہی تھیں؟

پھر— اُسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ لوگ شاید اوپر پہنچ گئے تھے۔ نظر نہیں آرہے تھے۔

مگر—؟ لوگوں کے ہجوم میں وہ ان سے بچھڑ گئی تو؟

اُس نے دیکھا۔ کوشش کے باوجود سنگین خان بال چھڑا نہیں سکا تھا۔ زیب مزید انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ اپنے بال اُس کے بٹن سے نوچنے لگی۔

اُس نے محسوس کیا۔ وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے بال تو الگ ہوگئے۔ مگر ایک ننھا سا گچھا اُس کے بٹن کے ساتھ ہی چپک کر رہ گیا۔

کوئی پرواہ کئے بغیر زیب تیزی سے اوپر چلدی۔

اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ آگے آصفہ کھڑی اُسکی طرف ہاتھ ہلا رہی تھی۔ وہ جلدی

سے اُن سے جا ملی۔

اوپر بیڈ رومز تھے۔ بادشاہ کے شاہانہ بیڈ روم کے دروازے کے چوکھٹ میں وہ خفیہ سیڑھیاں تھیں۔ جنہیں وہ کسی خطرے کے وقت استعمال کرسکتا تھا۔

وہاں سے گزرتے ہوئے وہ لوگ کوئین وکٹوریہ کے بیڈ روم میں آگئے۔ یہاں بھی شاہ کے بیڈ کی طرح چند سیڑھیوں کے اوپر کوئین کا مخملیں، جھالریں بیڈ تھا۔ فرنیچر، پردوں، دیواروں، بالکنیوں کی خوبصورتی کو الفاظ میں نہیں ڈھالا جاسکتا تھا۔ وہیں ساتھ ہی کوئین کے چھوٹے بچے کا بالکل چھوٹا سا بیڈ روم اور بستر تھا۔

کمال کا heating system تھا۔ جو ہیٹر آج کیروسین آئیل اور بجلی سے چلتے ہیں۔ وہ اُس زمانے میں ہردم کھولتے ہوئے پانی سے چلتے تھے۔

آگے چل کر کوئین کا ٹی روم تھا۔ یہاں سے Pavilion کے خوبصورت لانز اور باغات دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔

آخر میں وہ لوگ Pavilion Gift Shop میں آگئے۔ اُس نے Pavilion کے دو خوبصورت کارڈز خریدے۔ کہ اِس سے زیادہ اُسکی جیب اجازت نہیں دے رہی تھی۔

یہیں اُس نے ایکبار پھر سنگین خان کو دیکھا۔ دو قدم پر کھڑا Pavilion کا ایک بیش قیمت موڈل خرید رہا تھا۔

پے منٹ کر کے مڑنے لگا۔ تو نظریں زیب پر پڑگئیں۔

اور پھر— وہ سامنے دیکھنے لگا تھا۔

اِس کے باوجود زیب کو لگا۔ وہ اُسے مزید جان گیا تھا۔ مزید پہچان گیا تھا!

گاڑی مین بیٹھکر گھر کی طرف چلے۔ تو زیب خاموش خاموش سی کھڑکی سے باہر تک رہی تھی۔

''چپ چپ کیوں ہو؟'' آصفہ نے پوچھا۔

''ن۔ نہیں تو۔'' چونکتے ہوئے اُس نے رخ اندر کی طرف کرلیا۔

جانے کیوں؟ آج آصفہ سے سب کچھ شیئر نہیں کیا۔ نہیں بتایا کہ Pavilion میں

سیڑھیوں پر سنگین خان سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ یا ابھی کچھ دیر پہلے گفٹ شوپ کے کاؤنٹر کے پاس اُس کی نظروں میں اِس نے کچھ پڑھا تھا!

راستے میں پڑتے Mc Donald's میں اترے۔ تو وہ سب بھول بھال گئی۔

مزیدار برگرز کھائے۔ اپنی اپنی مرضی کی پیپسی اور شیکس پیئے۔ اور گھر آ گئے۔

رات ڈنر کے بعد وہ اور آصفہ اپنے بیڈروم میں آ گئیں۔

آصفہ کا چھوٹا سا بیڈروم بہت کیوٹ تھا۔ اُس کا نرم و گداز بیڈ تھا۔ وارڈروب تھا۔ ٹی وی تھا، کمپیوٹر تھا، چیئر تھی اور — کھڑکی میں سے دِکھتے دن میں کُہر میں دھندلائے اور رات میں کُہر میں سے چھنتی جھلملاتی بتیاں لئے سلیٹی ڈھلانی چھتوں والے خوبصورت مکانات!

آصفہ نے آجکل اپنا بیڈ زیب کو دے رکھا تھا۔ کہ مہمان جو تھی۔ خود نیچے کارپٹ پر بستر لگا کر پڑ رہتی تھی۔ بہت پیار تھا دونوں کا آپس میں۔ ہمعمر بھی تھیں، ہمدم و ہمراز بھی!

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ آصفہ پہلے ہی بستر پر لیٹ رہی تھی۔ زیب البتہ نماز پڑھ رہی تھی۔

فارغ ہوئی۔ تو وہ بھی اپنے بستر میں گھس گئی۔

کچھ دیر دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر —

آصفہ نے 'گڈ نائیٹ' کہا۔ اور کروٹ دوسری طرف لیتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کیونکہ صبح اُس نے یونیورسٹی بھی جانا تھا۔

زیب نے بھی آنکھیں موند لیں۔ مگر —

پتہ نہیں کیوں؟ نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ الجھی الجھی سی تھی۔ اَپ سیٹ سی بھی!

کیوں تھا ایسا؟ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی!

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آصفہ کی طرف دیکھا۔ اطمینان سے سو رہی تھی۔

وہ آہستہ سے اُٹھی۔ کچن میں گئی۔ گلاس میں پانی بھرا اور — گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

نظروں میں آج سارے دن کی مصروفیات گھومنے لگیں۔ شاندار Pavilion اور ساتھ ہی — اپنے بالوں کا سنگین خان کے کوٹ کے بٹن میں الجھنا —

پتہ نہیں کیوں؟ گلاس اُس کے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا۔

اُسکا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کسی مشین کی طرح کسی بھی جذبے سے عاری وہ اپنے کوٹ کا بٹن اُسکے بالوں سے چھڑا رہا تھا۔ اور — جب جب بھی اُس پر نظر پڑی۔ خالی ہی پڑی مگر —

اِس کے باوجود جانے کیوں؟ زیب کو لگا تھا۔ اُس کی کچھ نہ بولتی نظریں بھی معنی لئے تھیں۔ کیا؟ یہ وہ نہیں سمجھ پائی تھی!

پر — اُسے کیوں نیند نہیں آرہی تھی؟ وہ کیوں الجھی الجھی سی تھی؟ اُسکا خیال آتے ہی گلاس کیوں لرز گیا تھا اُس کے ہاتھ میں؟

مزید اَپ سیٹ ہوتے ہوئے اُس نے باقی کا پانی جلدی جلدی پیا۔ اور واپس کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گئی۔

آنکھیں بند کیں۔ اور پھر — جانے کس پہر نیند کی دیوی مہربان ہوئی۔ اور وہ سو گئی۔

دن کے دس بج رہے تھے۔نواز کالو اپنے آفس اور آصفہ اور کاشف یونیورسٹی جا چکے تھے۔نازیہ خالی ضروری کاموں سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں بیٹھیں قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔

تبھی—زیب پاس چلی آئی۔

''نازیہ خالہ۔میں نے امی اور ابو کے لئے کچھ شوپنگ کرنی ہے۔آپ نے کچھ منگوانا ہوتو بتائیں''۔

نازیہ خالہ نے ہی اُسے کہا تھا۔کہ وہ روزانہ نکلا کرے۔یہی چند دن ہیں۔ جتنا چاہے گھوم پھر لے۔یہ جگہ اتنی بڑی اور پیچیدہ نہیں تھی۔کہ وہ راستہ بھول جاتی۔اگر ایسا ہوبھی جاتا۔تو کسی سے

پوچھ کر مطلوبہ جگہ تک پہنچ سکتی تھی۔پھر اُسے اب تک تقریباً ہر جگہ کے بس نمبر وغیرہ پتہ چل چکے تھے۔
بقول اُن کے اُسے خوب خوب پھرنا چاہیے تھا۔پاکستان سے آؤ۔اور گھر میں بیٹھ رہو۔وہ اِس حق میں بالکل نہیں تھیں اور پھر کسی خاص جگہ جانا ہوتا تھا۔تو ویسے بھی ویک اینڈز پر سب مل کر اپنی گاڑی میں چلے جاتے تھے۔وِزٹ بھی کرآتے تھے۔ساتھ میں زیب کو اُس جگہ سے متعلق تمام معلومات بھی فراہم کرتے جاتے تھے۔

سیریل، بریڈ، جوس وغیرہ ختم تھے۔خالہ نے چیزیں کاغذ پر لکھ کر دیں۔اور وہ اپنے کمرے میں تیار ہونے چلدی۔

کوفی پنک شلوار قمیص اور کپڑوں سے میچ کرتا پھولدار دوپٹہ لیتی، بیگ کندھے سے لٹکاتی، وہ گھر سے باہر نکل آئی۔

فٹ پاتھ پر بائیں رخ چلتے ہوئے اُس نے آس پاس نگاہ کی۔دائیں جانب سڑک کے اُس طرف سرسبز ڈھلان پر بنے خوبصورت گھروں کی سلیٹی ڈھلانی چھتیں دھند میں لپٹی تھیں۔دور اُس پار سمندر کُہر میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔بائیں جانب اُن کی پہاڑی پر کے گھر واضح نظر آرہے تھے۔اور۔آسمان کی وسعتوں پر بگلہ سے سفید بادلوں کا راج تھا۔

تھوڑا سا ہی آگے چل کر وہ بائیں سمت مڑتے ہوئے پگڈنڈی پر شورٹ کٹ لیتی اوپر آتے ہوئے قریب کے بس سٹینڈ پر آگئی۔جلدی ہی ٹاؤن سینٹر جانے والی بس آکر رُک گئی۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ڈرائیور سے ٹکٹ لیا، پے منٹ کی، اور ایک خالی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔

شوپنگ سینٹر کے قریبی سٹاپ پر بس رُک گئی۔وہ اُتر آئی اور پیدل چلتی بازار میں آگئی۔

خالہ کی چیزیں بھی خریدیں، امی اور ابو کے لئے بھی گفٹس لئے۔دیر تک اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔پھر وہیں ایک ریسٹورانٹ میں پیزا کھایا اور—

بس سٹاپ تک جانے کے لئے بائیں طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔

چند ہی قدم چلی تھی۔کہ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔اُس نے قدم تیز کر لئے۔مگر راستہ اب بھی خاصا تھا۔

تبھی— اُس کے قریب ہی سڑک پر ایک گاڑی آ کر رُکی۔

اُس نے دیکھا۔سنگین خان تھا۔کچھ بھی بولے بغیر اُس کی طرف کا پسنجر سیٹ کا دروازہ اُس کے لئے کھول دیا۔

بارش تیز تر ہو رہی تھی۔مگر ایسا بھی نہیں تھا۔کہ وہ بارش میں سٹاپ تک نہیں جاسکتی تھی۔

وہ منتظر تھا۔وہ بھی رُک گئی تھی لیکن—

''آؤ۔بارش ہے۔'' پہلی بار زیب نے اُس کی آواز سنی۔

''نو تھینک یو۔بس سٹاپ قریب ہے۔میں چلی جاؤں گی۔''

سنگین خان نے کچھ نہیں کیا۔خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔دروازہ بند کیا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ بھی— اُسی رخ— پھر سے چلنے لگی۔

''آؤ۔بارش ہے۔'' اُس کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

پتہ نہیں کیوں؟ ایک دلآویز مسکراہٹ اُس کے خوبصورت لبوں کو چھوگئی۔

آج —بولا تو!

مختصر الفاظ، دھیما لہجہ، پرکشش انداز!

بس میں بیٹھی۔تو بھی اُس کی آواز پیچھا کرتی رہی۔

قریباً آدھا گھنٹہ بعد بس اُن کے علاقے میں رُکی۔تو وہ اتر گئی۔

کندھے سے لٹکا بیگ، دونوں ہاتھوں میں شوپنگ بیگز اور اوپر سے ہنوز برستی بارش!

وہ بمشکل خود کو سنبھال پا رہی تھی۔

ایسے میں— ایکبار پھر سنگین خان نے اُس کے بالکل پاس آتے ہوئے گاڑی روکی۔اور ایکبار پھر اُس کی طرف کا پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا۔

اِس بار بولا کچھ نہیں۔بس اُسے تکتا اور اُسکا انتظار کرتا رہا۔

جانے کیوں؟ اِس بار اُس نے بھی انکار نہیں کیا۔ایٹی کیٹس کے خلاف سا لگ رہا تھا۔وہ تو بار بار مدد کی آفر کر رہا تھا۔اور وہ reject کرتی جاتی۔کچھ اچھا نہیں لگا اُسے۔ہاں—

یہ الگ بات تھی۔کہ وہ اُسے جانتی تک نہیں تھی۔پرفیکٹ اجنبی تھا وہ اُس کے لئے!

بہرحال— وہ بیٹھ گئی۔بیگز نیچے پاؤں کے پاس رکھ دیئے۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

زیب نے کوئی جیکٹ وغیرہ بھی نہیں پہنا تھا۔بُری طرح بھیگ چکی تھی۔

''آپ کی گاڑی کی سیٹ بھیگ جائے گی۔'' اُس نے اندیشہ ظاہر کر ہی دیا۔

سنگین خان نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا اور— کچھ بھی بولے بِنا پھر سے نظریں سڑک پر جما دیں۔

شیشے پر وائپرز تیزی سے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔بارش کی وجہ سے اُس کی رفتار خاصی کم تھی۔وہ احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''تم بہت بھیگ گئی ہو۔'' سامنے ہی دیکھتے ہوئے اُس نے سکوت توڑا۔

زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔خاموشی سے سامنے دیکھتی رہی۔

وہ پگڈنڈی جہاں سے وہ شورٹ کر کے اوپر بس سٹاپ پر آتی تھی۔گزر چکی تھی۔وہ ڈھلان جس پر اُن کے گھر کے علاوہ بھی چند گھر تھے۔وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔

''تمہارا گھر یقیناً وہیں کہیں ہوگا۔'' اُس کا اشارہ پیچھے بس سٹاپ کی طرف تھا۔''لیکن روڈ سے جاؤ۔تو راستہ لمبا ہو جاتا ہے۔'' وہ جیسے اُسے صفائی دینے لگا۔یا پھر— کہ وہ پریشان نہ ہو۔

اُس نے ایک نظر اُسکی طرف دیکھا اور پھر سے شیشے کے اُس پار دیکھنے لگی۔

پہاڑیوں پر بنے سلیٹی ڈھلانی چھتوں والے گھر۔بادل، بارش— سب بہت پُرفریب لگ رہا تھا۔

''تم — شاید یہاں نئی ہو۔'' اُس کی نظریں اب بھی سڑک پر تھیں۔

''جی۔میری خالہ یہاں رہتی ہیں۔میں اُن کے پاس آئی ہوں۔''

"I see."

اب ساحلی علاقہ آ گیا تھا۔اُس نے ایکبار پھر دائیں ٹرن لیا۔

''تمہارا گھر تو خاصا پیچھے رہ گیا ہے۔لیکن میرا گھر وہ سامنے ہے۔'' اُس نے سٹریٹ کے

آخری گھر کے پیچھے سمندر کے رخ واقع ایک بہت خوبصورت گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رفتار دھیمی کرلی۔ ''تمہارے کپڑے بالکل بھیگ گئے ہیں۔تم چاہو تو۔۔۔''

اُس نے دیکھا۔زیب کا رنگ بدلنے لگا تھا۔

''ایک کپ کوفی پی سکتی ہو۔یہیں گاڑی میں۔'' اُس نے جلدی سے اپنی بات پوری کی۔ آخری جملے پر زور بھی دیا۔

''نہیں۔نہیں۔آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔''

اُس نے 'نہیں نہیں' کے الفاظ اسقدر گھبراہٹ میں ادا کئے کہ وہ اپنی ہنسی بمشکل چھپا سکا۔ خاموشی سے ایکبار پھر گاڑی آگے بڑھانے لگا۔

وہ بھی سامنے دیکھ رہی تھی۔جانے کیوں اِس آدمی سے کچھ مرعوب سی تھی۔

وہ بہت پیسے والا تھا یہ بات نہیں تھی۔بلکہ—شاید وہ بہت imposing تھا اِس لئے۔ شاید بہت amiable تھا اسلئے، پتہ نہیں کیا تھا؟ وہ خود بھی واضح نہیں تھی اُس کے بارے میں!

ایکبار اور گاڑی دائیں موڑتے ہوئے اُس نے نظریں سیاہ کولتار کی سڑک پر جمادی تھیں۔

بارش اب کم ہو رہی تھی۔کچھ دیر قبل والی تیزی نہیں رہی تھی۔

''اب میں اُتر جاؤں؟'' وہ جیسے اُس سے اجازت مانگنے لگی۔

''کیوں؟'' ایکبار پھر اُس نے اُسکی طرف دیکھا۔

''وہ۔۔۔بارش کم ہوگئی ہے نا۔''

اُس نے رخ دوبارہ سڑک کی طرف کرلیا۔

''نہیں''۔وہ مختصراً بولا۔

اور—اُس کے لہجے کا تحکم دیکھکر وہ چپ چاپ بیٹھ رہی۔

بس شاپ سے لیکر اب تک گاڑی ایک بڑا سا چوکور کاٹ کر اب اُس کے سٹریٹ کے قریب آرہی تھی۔وہیں سٹریٹ میں بائیں طرف چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے گھروں میں سے ایک گھر نازیہ خالہ کا تھا۔

''وہ والا گھر ہمارا ہے''۔اُس نے دور سے ہی اُسے اشارے سے بتایا۔آپ گاڑی یہیں روک لیں۔میں خود چلی جاؤں گی۔''

''وہ سمجھ گیا۔وہ اُس کے ساتھ گھر تک نہیں جانا چاہتی تھی۔شاید رشتہ داروں کے دیکھ لینے کی وجہ سے۔

اور—کچھ آگے بڑھتے ہوئے وہ اُنکی سٹریٹ میں آگیا۔پھر—وہیں بائیں جانب گاڑی روک لی۔باہر آتے ہوئے اُس کے لئے دروازہ کھولا۔

وہ اُتری۔تو اُس کا سامان اٹھانے میں اُسے مدد دی۔

زیب نے اُسکا شکریہ ادا کیا۔اور آگے بڑھ گئی۔

وہ بھی گاڑی میں بیٹھا۔اور ریورس جاتے ہوئے گاڑی دوبارہ مین روڈ پر ڈال دی۔

اُس کے دن الجھے الجھے اور راتیں بے چین ہو رہی تھیں۔ دن کو اکیلی اور شام کو و
آصفہ اور کاشف کے ساتھ ضرور کہیں نہ کہیں چلی جاتی۔ یہ چھوٹا سا سمندر کنارے آباد خوبصورت شہ
جیسے باقی ٹورسٹس کے لئے انوکھی اٹریکشن رکھتا تھا۔ وہ بھی کچھ کم لطف اندوز نہیں ہوتی تھی لیکن —
پتہ نہیں کیا تھا؟ وہ کچھ بے کل سی رہنے لگی تھی۔

یہ آصفہ نے بھی نوٹ کیا تھا۔ اکیلے میں اُس سے وجہ بھی پوچھی۔ لیکن — وہ خود کلیئر ہو
تو اُسے بتاتی!

'Brighton Pier' پر وہ پہلے بھی آصفہ اور کاشف کے ساتھ جا چکی تھی۔ آج پھر
للچایا۔ کہ سمندر کے پانیوں پر بنے اِس لمبے اور چوڑے پلیٹ فارم پر سال بھر تفریح ہی تفریح ہو

تھی۔ اور پھر — پلیٹ فارم کے آخری اور چھت سے ڈھکے حصے کے اندر داخل ہوتے ہی زبردست فِشن اینڈ چپس، لذیذ ڈونٹس اور برگرز!

آگے جاؤ تو بچوں کے لئے گیمز، ڈاجم کارز، کیروسیل، بڑوں کے لئے Turbo Coaster اور Slot Machines۔ پھر سب سے بڑھ کر پیئر پلیٹ فارم پر باہر ہی ریلنگ کے پاس کھڑے ہو کر تیز ہوا کے وار سہتے ہوئے تاحدِ نگاہ سمندر کے سبزی مائل نیلے پانیوں کا نظارہ!

حسبِ معمول وہ بس میں بیٹھی۔ اور سیدھی جا پہنچی برائیٹن پیئر۔

اندر گا[illegible] تفصیلی چکر لگایا۔ آخر میں مزیدار برگر کھایا۔ اور پیپسی ساتھ لیتی باہر آ کر ریلنگ کے پاس کھڑی ہوتے ہوئے [illegible]ں پانیوں پر نظریں جمتی گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

پھر — وہ چونکی۔ اُس سے [illegible]ار قدم پر ہی سنگین خان کھڑا سمندر کی لامحدود وسعتوں پر نظریں جمائے تھا۔

جانے کیوں؟ اُسکا دل بے اختیار دھڑکا۔

اُسے یہاں پا کر اُسے انوکھی سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ ایسی خوشی۔۔۔۔ جو اِس سے پہلے اُس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

وہ اُسے دیکھ ہی رہی تھی۔ کہ سنگین خان نے اچانک رخ اُسکی طرف کر لیا۔

اُسے دیکھا۔ تو پاس چلا آیا۔

''ہیلو''۔ وہ دھیرے سے بولا۔

''ہائے۔'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

سنگین خان نے دیکھا۔ اُس کے بہت ہی خوبصورت چہرے پر لالی سی بکھر گئی تھی۔ سیاہ خمیدہ پلکیں جھک گئی تھیں۔

ایک مبہم سی مسکراہٹ اُس کے پرکشش لبوں کو چھو گئی۔

زیب نے پھر سے پانیوں پر نظریں جما دیں — چپ چاپ!

''پیئر اچھا لگا؟'' وہ اُس سے باتیں کرنے لگا کہ —

وہ جو speechless ہوئی جا رہی تھی۔

اُس کے دن الجھے الجھے اور راتیں بے چین ہو رہی تھیں۔ دن کو اکیلی اور شام کو وہ آصفہ اور کاشف کے ساتھ ضرور کہیں نہ کہیں چلی جاتی۔ یہ چھوٹا سا سمندر کنارے آباد خوبصورت شہر جیسے باقی ٹورسٹس کے لئے انوکھی اٹریکشن رکھتا تھا۔ وہ بھی کچھ کم لطف اندوز نہیں ہوتی تھی لیکن —

پتہ نہیں کیا تھا؟ وہ کچھ بے کل سی رہنے لگی تھی۔

یہ آصفہ نے بھی نوٹ کیا تھا۔ اکیلے میں اُس سے وجہ بھی پوچھی۔ لیکن — وہ خود کلیئر ہوتی تو اُسے بتاتی!

'Brighton Pier' پر وہ پہلے بھی آصفہ اور کاشف کے ساتھ جا چکی تھی۔ آج پھر جی للچایا۔ کہ سمندر کے پانیوں پر بنے اِس لمبے اور چوڑے پلیٹ فارم پر سال بھر تفریح ہی تفریح ہوتی

تھی۔ اور پھر — پلیٹ فارم کے آخری اور چھت سے ڈھکے حصے کے اندر داخل ہوتے ہی زبردست فِشن اینڈ چپس، لذیذ ڈونٹس اور برگرز!

آگے جاؤ تو بچوں کے لئے گیمز، ڈاجم کارز، کیروسیل، بڑوں کے لئے Turbo Coaster اور Slot Machines۔ پھر سب سے بڑھ کر پیئر پلیٹ فارم پر باہر ہی ریلنگ کے پاس کھڑے ہو کر تیز ہوا کے وار سہتے ہوئے تاحدِ نگاہ سمندر کے سبزی مائل نیلے پانیوں کا نظارہ!

حسبِ معمول وہ بس میں بیٹھی۔ اور سیدھی جا پہنچی برائیٹن پیئر۔

اندر کا ایک تفصیلی چکر لگایا۔ آخر میں مزیدار برگر کھایا۔ اور پیپسی ساتھ لیتی باہر آ کر ریلنگ کے پاس کھڑی ہوتے ہوئے نیلگوں پانیوں پر نظریں جمتی گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

پھر — وہ چونکی۔ اُس سے تین چار قدم پر ہی سنگین خان کھڑا سمندر کی لامحدود وسعتوں پر نظریں جمائے تھا۔

جانے کیوں؟ اُسکا دل بے اختیار دھڑکا۔

اُسے یہاں پا کر اُسے انوکھی سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ ایسی خوشی۔۔۔ جو اس سے پہلے اُس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

وہ اُسے دیکھ ہی رہی تھی۔ کہ سنگین خان نے اچانک رخ اُسکی طرف کر لیا۔

اُسے دیکھا۔ تو پاس چلا آیا۔

''ہیلو''۔ وہ دھیرے سے بولا۔

''ہائے۔'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

سنگین خان نے دیکھا۔ اُس کے بہت ہی خوبصورت چہرے پر لالی سی بکھر گئی تھی۔ سیاہ خمیدہ پلکیں جھک گئی تھیں۔

ایک مبہم سی مسکراہٹ اُس کے پرکشش لبوں کو چھو گئی۔

زیب نے پھر سے پانیوں پر نظریں جما دیں — چپ چاپ!

''پیئر اچھا لگا؟'' وہ اُس سے باتیں کرنے لگا کہ —

وہ جو speechless ہوئی جا رہی تھی۔

''جی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ہاتھ میں پکڑے پیپسی کے ٹن کو دیکھنے لگی۔

آج — وہ اُسے کچھ بدلی بدلی سی لگی۔ ایکبار پھر اُسکے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ اُبھری۔

''میرا خیال ہے۔ آج ہمیں ایکدوسرے سے اپنا تعارف کروا ہی لینا چاہیے کہ ہم ایک ہی شہر میں رہ رہے ہیں۔ اور — اتفاقاً بار بار مِل بھی لیتے ہیں۔۔۔''

وہ رخ پھیر کر اُسے دیکھنے لگی۔

''میرا نام سنگین خان ہے''۔ وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میں پاکستان سے ہوں — کام سے تھک جاتا ہوں تو گرمیوں میں چند ہفتوں کے لئے یہاں آجاتا ہوں۔۔۔''

وہ اب بھی اُسے تک رہی تھی۔ چپ چاپ۔ دونوں جذبے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اُسے اچانک وہاں پانے پر جہاں اُس کا حسین چہرہ دمک اٹھا تھا۔ وہاں — ایسا ہو جانے پر وہ پریشان سی بھی لگ رہی تھی۔

اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ یہ سب تو وہ پہلے بھی جانتی تھی اُس کے بارے میں۔ اُس کے تعارف کے جواب میں اپنا تعارف تک نہ کرا سکی۔

''مِس — تمہارے گھر والوں نے بھی تمہارا کوئی تو نام رکھا ہوگا'' ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے وہ مزید بولا۔

''میرا نام زیب ہے۔ میں بھی پاکستان سے ہوں۔'' اُس نے بھی اپنا تعارف کروا دیا۔ کہ کرٹسی کا تقاضا یہی تھا!

تھوڑی دیر یوں ہی دونوں خاموشی سے دور تک پانیوں پر نظریں جمائے رہے۔

''کس کلاس میں پڑھتی ہو؟'' اُس نے گفتگو آگے بڑھانے کی خاطر کہا۔

''بی اے کا ایگزیم دیا ہے''۔

''اچھا''۔

چند پل مزید خاموش رہی۔

''آگے پڑھوگی؟''

''اِرادہ تو ہے''۔

''اُس کے بعد — کیا کروگی؟'' وہ یوں ہی بولا۔

پتہ نہیں کیوں؟ زیب کو ہنسی آگئی۔ اُسے معلوم تھا۔ وہ یہ سب ویسے ہی پوچھے جا رہا تھا۔ کہ وہ جو بالکل چُپ سادھے تھی!

''وہ جو دوسرا Pier ہے''۔ زیب نے تھوڑے فاصلے پر بالکل اِسی طرح کے ایک اور عجیب جلے ہوئے سے شکل کے پیئر کی طرف اشارہ کیا کیونکہ اب کچھ بامقصد بات ہونی چاہیے تھی۔

''یہ۔۔۔ ایسا کیوں ہے؟''

اُسے اچھا لگا۔ وہ بات تو کرنے لگی تھی!

''یہ پہلے اِس پیئر کی طرح تھا۔ جیتا جاگتا۔ مگر سیکنڈ ورلڈ وار میں تباہ کر دیا گیا تھا''۔

''اوہ''!

''اندر چلوگی؟'' سنگین خان نے پوچھا۔

کیونکہ وہ ابھی اندر نہیں گیا تھا۔ باہر ہی سے سمندر، سمندر میں تیرتی کشتیوں، سوئمنگ کرتے لوگوں، ساحل پر کے ہجوم اور پتنگیں اُڑاتے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔

''میں تو۔۔۔ ہو آئی ہوں''۔

''دوبارہ جانے میں کیا حرج ہے۔ آؤ''۔ اُس نے بالکل اچھے دوستوں کی طرح کہا۔

وہ انکار نہ کر سکی۔ ساتھ ہولی۔

مگر — دل ایک انجانے سے خوف سے لرز اُٹھا۔

اُسے یہاں دیکھکر اُس کا دل کیوں دھڑکا تھا؟ خوشی کیوں محسوس ہوئی تھی؟

اندر سارا گھوم پھر کر وہ واپس باہر آگئے۔

''اب میں گھر چلوں گی۔ کافی دیر ہوگئی ہے''۔ زیب نے کھلے پلیٹ فارم پر آتے ہی کہا۔

جانے کیوں اُس کی سنگت میں اپنی خوشی سے اُسے ڈر سا لگنے لگا تھا!

''چلو۔ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔''

''نہیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔'' وہ مزید اُس کے قریب رہنا نہیں چاہتی تھی۔

'''تم مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہو۔آؤ''۔ وہ متانت سے بولا کہ —

اُس کی جھجک اور آنکھوں میں اندیشے پڑھ کر وہ یہی سمجھا کہ وہ اُس پر ٹرسٹ نہیں کر رہی۔

وہ پھر ساتھ ہو لی۔ کہ ایسا نہ کرتی۔تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ اُس پر ٹرسٹ نہیں کر رہی۔

راستے میں وہ اُس کے ساتھ بہت دلچسپ انداز میں باتیں کرتا رہا۔

پہلے کچھ اُس سے متعلق کہ — وہ پاکستان میں کہاں رہتی تھی؟ واپس پاکستان کب جا رہی تھی؟ وغیرہ۔ اور پھر اِس حیران کن حد تک خوبصورت ٹوورسٹ ریزورٹ کے بارے میں مختصر مگر بہت انٹرسٹنگ معلومات فراہم کیں۔

یہاں بہترین یونیورسٹیز تھیں۔ دنیا کے کونے کونے سے لوگ پڑھنے آتے تھے۔ برطانیہ کی سیاسی اور سرکاری میٹنگز اکثر یہیں منعقد ہوتی تھیں۔ میوزیمز اور آرٹ گیلریز تھیں۔ لائبریریز تھیں۔ بے شمار ہوٹیلز تھے۔ بیچ فرنٹ Pizzerias، سی فوڈ ریسٹورانٹس، بیچ کیفے اور ٹیریس بارز تھے۔

پھر 'The Lanes' تھا۔چھوٹی چھوٹی بل کھاتی سٹریٹس کا سلسلہ۔

یہاں بے شمار ستائکش دکانیں تھیں، ریسٹورانٹس تھے اور Pavement Cafes تھیں۔

اور — سٹی تھیٹرز اور آرٹ گیلریز میں بیسٹ ڈرامہ، ڈانس، اوپرا اور میوزک ہوتا تھا۔

ٹاپ سٹارز رائل تھیٹر میں پرفارم کرتے تھے۔

"There is a great live music scene and often the entertainment spills out on the streets with Jazz bands, street theatre and mime artists..."

سڑک پر نظریں جمائے درمیانی رفتار سے ڈرائیو کرتا وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بتا رہا تھا۔

وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔اُس کی معلومات سے محضوظ ہو رہی تھی۔

پھر — اُس نے گاڑی آہستہ سے بائیں موڑ لی۔آگے بڑھنے لگا۔

یہاں 'برائیٹن مرینہ' تھا، مرینہ یہیں واقع ایک اہم علاقہ تھا۔

''تم 'برائیٹن مرینہ' آئی ہو؟'' اُس نے زیب سے پوچھا۔

''ہاں''۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''یہاں بھی بہت کچھ ہے۔ There is an eight screen cinema, jim, famous brand names shops and — lots of water front restauran

ہاں سے فیری میں جاؤ تو فرانس تک کا فاصلہ صرف 81 میل ہے۔مہرینہ میں ہر سال فرانس سے آکر ال خود French Market لگاتے ہیں۔ اُس میں کئی قسم کی Chease ہوتی ہے۔ عمدہ ائنز، بہت ہی مزیدار پیسٹریز ہوتی ہیں۔فِش ہوتا ہے اور جانے کیا کیا۔۔۔''

''آپ یہاں سے خوب واقف لگتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔

''میں نے یہیں سے پڑھا ہے سب۔ Brighton is a second home of mine. ں آتا جاتا رہتا ہوں یہاں۔''

وہ پھر خاموشی سے باہر دیکھنے لگی۔

اُس نے جن چیزوں کا ذکر کیا تھا۔ کچھ کچھ اُس نے آصفہ اور خالہ لوگوں کے ساتھ دیکھا بھی تھا۔مگر بہت سی باتیں صرف آج اُس سے پتہ چلی تھیں۔

اُس کا اندازِ گفتگو مرعوب کن تھا، شخصیت میں اتھارٹی تھی اور — آنکھوں میں کمانڈ!

اُس نے جب جب اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ڈول ڈول سی گئی۔ اور —

تب تب ہی اُس نے دل میں سوچا، وہ مزید اُسے نہیں ملے گی۔ یہ راستہ اُس کے لئے نہیں تھا۔اُس کی دنیا الگ تھی!

اُس نے اُسی جگہ گاڑی روک لی۔ جہاں پچھلی بار اُسے ڈراپ کیا تھا۔

گاڑی سے اترتے ہوئے وہ سامنے سے گھوم کر اُس کی طرف آگیا۔ اُس کے لئے دروازہ کھولا۔

وہ اترنے لگی۔تو سنگین خان قدرے پرے ہٹ گیا۔ ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے کوٹ کے بٹن پر گیا۔ نادانستہ طور پر اُس نے اُس کے بال اپنے بٹن میں دوبارہ اٹکنے سے بچانے کی کوشش

کی تھی۔

زیب نے اپنی ہنسی صاف چھپالی۔ جھکا سر اٹھایا تو دیکھا—
اُس کے پرکشش لبوں پر بھی موہوم سی مسکراہٹ تھی!
ایکبار پھر— اُس کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔
جانے کو قدم بڑھائے۔ تو سنگین خان نے اُسے 'خدا حافظ' کہا اور—
گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنی راہ لی۔

کل ویک اینڈ تھا۔ کاشف رات کھانے کے بعد آصفہ اور زیب کے لئے بھی کوفی بنا کر اُن کے ہی کمرے میں آبیٹھا تھا۔ زبردست گپ شپ کے دوران تینوں مزیدار کوفی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

تقریباً ہر موضوع زیرِ بحث آیا۔ بس بات نہیں ہوئی۔ تو زیب کی سنگین خان سے بار بار ٹکراؤ کی۔ کچھ خوف سا تھا، ڈر سا۔ کچھ بے کلی سی تھی، پریشانی سی!

رات گئے تک باتیں جاری رہیں۔ کل دن کو پودوں کی نرسری اور پھر رات کو برائیٹن مرینہ میں بوٹ میں بنے چائنیز ریسٹورانٹ میں ڈنر کھانے کا پروگرام بنا کر ہی کاشف وہاں سے ٹلا۔

آصفہ اور زیب اپنے اپنے بیڈ پر پڑ رہیں۔ آصفہ اب بھی کھسر پھسر کرتی رہی۔

''اب سو جاؤ۔ کل اُٹھ نہیں سکو گی پھر۔'' زیب نے کہا۔

''ہاں۔ اب سونا چاہیے۔ ورنہ تم تو پھر بھی جاگ جاتی ہو۔ مجھ سے نہیں اُٹھا جاتا۔''

''تم دن بھر یونیورسٹی میں بھی تو تھک جاتی ہو۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔ اچھا گڈ نائیٹ۔'' آصفہ نے مخالف سمت کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

''گڈ نائیٹ۔'' اُس نے بھی آنکھیں موند لیں۔ مگر—

وہ جھنجلا اٹھی۔ اُسے کیا ہو گیا تھا؟ نہ پہلے کی طرح نو بجتے ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتی تھیں۔ نہ بستر پر پڑتے ہی بے خبر ہو کر سو رہتی تھی۔

پھر— جانے کس پہر غنودگی نے آلیا۔ اور اُسکی آنکھ لگ گئی۔

نازیہ خالہ، آصفہ، کاشف اور زیب ایکڑوں پر پھیلی نرسری کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کر کے باہر نکل آئے۔

ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف ریسپشن تھا۔ وہیں کاؤنٹر پر ایک انگریز لڑکی کھڑی ڈیوٹی دے رہی تھی۔

وہاں سے آگے بڑھے۔ تو بائیں ہاتھ پر چھوٹے چھوٹے بہت ہی پیارے پیارے گھروندے نظر آئے۔ یہ بلیوں کے گھر تھے۔ گھروں میں اُن کے چھوٹے چھوٹے بیڈز تھے۔ کھیلنے کودنے کے لئے طرح طرح کی جگہیں بنی تھیں۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان تھا۔ پھر اسی طرح کتوں کے dens تھے۔ اُن کے رہن سہن کا بندوبست تھا۔ بلیوں اور کتوں کے یہ انوکھے پرکشش گھر

برائے فروخت تھے۔

دائیں طرف باغبانی کا ہر قسم کا سامان تھا۔ بنے بنائے خوبصورت باڑ تک موجود تھے۔ پھر— ریکس میں لگے انواع واقسام کے بیج، پھر کھاد کے پیکٹس اور— پھر کچھ ان ڈور عجیب وغریب پودے!

وہ اندر آصفہ گھوم پھر کر ایکبار پھر بلبلیوں کے گھروندوں میں جھانک رہی تھیں۔

''یہ پودے سنگین خان نے آرڈر کروائے ہیں۔'' سٹاف میں سے ایک اور انگریز لڑکی کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو ایک فہرست پکڑاتے ہوئے انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

چونکتے ہوئے اُس نے اُس طرف دیکھا۔ بیک وقت آصفہ بھی دیکھنے لگی۔

کاؤنٹر کی لڑکی فہرست پر نظریں دوڑانے لگی۔

''پودے تو سب ہیں۔ لیکن جو فوارہ منگوایا ہے۔ وہ اِس وقت موجود نہیں ہے۔ پر— ہم لنڈن سے منگوادیں گے۔ "After all he is our permanent client." لڑکی نے کہا اور— اُسے فون پر مطلع کرنے لگی۔

"Sir, the plants are all here. But for fountain, you will have to wait for a couple of days. We will order it from London...."

دونوں لڑکیاں خاصی concerned نظر آ رہی تھیں۔

آصفہ مسکرا دی۔

''پیسہ ہے۔ گلیمر ہے۔ اوپر سے بقول تمہارے بہت ہینڈسم بھی ہے۔ بیچاری لڑکیاں۔۔۔'' آصفہ نے کہا۔

زیب بھی آصفہ کی بات پر مُسکرا دی۔

اب وہ لوگ ہال کے پچھلے دروازے سے باہر نکل آئے۔

یہاں دور دور تک قسم قسم کے موسمی خوشنما اور خوش رنگ پھولوں کے تختے کے تختے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ موسم چونکہ پاکستان سے بالکل مختلف تھا۔ اِس لئے تقریباً تمام پھول پودے اُس کے لئے نئے ہی تھے۔

وہ چاروں آگے ہی آگے چلتے چلے گئے۔

اب دائیں طرف اونچے اونچے ریکس میں باغ باغیچوں کے لئے سامان لگے تھے۔ نیچے لاتعداد اور بے حد خوبصورت گملے رکھے تھے۔ لانز کے لئے پیسٹل میز کرسیاں تھیں۔ مختلف قسم کے بینچ تھے۔ اور پھر—

بائیں جانب طرح طرح کے ڈیزائین کئے پانی کی آبشاریں رواں دواں تھیں۔ پانی کہیں کسی کوہ سے نکل رہا تھا۔ تو کہیں کسی پرندے کی چونچ سے ٹپک رہا تھا۔ کہیں کسی کنوئیں سے ڈول بھر بھر کر تالاب میں گر رہا تھا۔ تو کہیں مصنوعی گرج چمک کے ساتھ بوندیں پڑنا شروع ہو جاتی تھیں۔ بہت حسین ماحول تھا۔

قریباً دو بجے وہ لوگ گھر پہنچ گئے۔

لنچ کے بعد نازیہ تو اپنے بیڈروم میں جا کر سو رہیں۔ اور وہ، آصفہ اور کاشف پچھلی طرف لان میں آ گئے۔

وہ دونوں بینچ پر بیٹھ گئیں۔ اور کاشف اپنے چھوٹے سے لان میں لان موؤر چلانے لگا۔

تبھی— اُس کے گھر سے فون آ گیا۔ امی ابو تھے۔ دیر تک اُس سے باتیں کیں۔ بہت یاد کر رہے تھے اُسے۔ ایک اکلوتی اولاد جو رہ گئی تھی۔ غم کھائے ماں باپ تھے۔ بہت اکیلا محسوس کر رہے تھے۔

وہ بھی کیا کم دکھی تھی اپنی بہن کے لئے؟

سوا سال کا فرق تھا دونوں میں۔ بس ہم عمر ہی تھیں جیسے۔ ہمدم وہمراز ایک دوسری کی۔ بے انتہا پیار تھا آپس میں۔ کبھی بہن بھائیوں والا روایتی جھگڑا بھی نہیں ہوتا تھا آپسمیں۔ ہمیشہ پیار محبت سے رہیں۔ جبھی تو—

قیامت ٹوٹی تھی — جب وہ ایکسیڈنٹ میں گزر گئی تھی۔

وہ رنج والم میں ڈوبے ماں باپ کو تسلی دیتی۔ مگر— خود پورا سال گزرنے پر بھی recover نہیں کر پائی تھی۔ کیسے کر پاتی کہ کالج اور گھر میں تو وہ ہر وقت ساتھ تھی ہی پر— اُس کا تو خون بھی اُسکی ہی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اُس کا کیا کرتی؟

جی رہی تھی وہ بھی بس——اپنے ماں باپ کے لئے۔ کہ اُسے دیکھکر ہی——وہ جی رہے تھے!

فون بند کرنے لگی۔تو آنکھیں نم ہوگئیں۔

آسفہ سمجھ گئی۔ پھر زینیہ یاد آئی تھی۔ اُس کا سر اپنے کندھے سے لگالیا۔ اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔

''زیب! خود کو سنبھالو۔ دعا کیا کرو اُس کے لئے۔تم نے فوزیہ خالہ اور فیاض خالو کے لئے خود کو مضبوط بنانا ہے۔فیاض خالو ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ یہ بھی خیال رکھنا ہے۔۔۔''

اِن کے سامنے تو میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ نہ روؤں۔ نہ یاد کروں اُسے۔مگر——اکیلے میں خود پر اختیار نہیں رہتا۔آصفہ! بہت یاد آتی ہے مجھے زینیہ۔۔۔'' کہتے کہتے وہ آصفہ کے گلے لگ کر آج پھر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

وہ لوگ اُس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ ملنے جلنے کی کھلی چھوٹ نہیں دی جاتی مگر——

جانے کب اور کیسے زینیہ کو ایک لڑکے سے محبت ہوگئی۔زیب کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ایک دن زینیہ کی ایک کلاس فیلو اور قریبی دوست نفیسہ نے اُسے بتایا۔کہ وہ زینیہ کو سمجھائے۔اُس لڑکے کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ ایک امیر گھرانے کا پکا فلرٹ تھا۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں زینیہ روتی پھرے۔ جب اُس نے زینیہ سے بات کی۔تو اُس نے کہا۔کہ وہ اُسکی محبت میں بہت آگے نکل چکی ہے۔واپس نہیں لوٹ سکتی۔اور وہ لڑکا اُسکے ساتھ سیریس ہے۔شادی کرنا چاہتا ہے اُس سے۔۔۔

''اچھا نام تو بتاؤ؛ ہار مانتے ہوئے اُس نے پوچھا تھا۔

وہ مُسکرادی تھی۔

''نہیں۔''

''اچھا ہے کون؟ رہتا کہاں ہے؟''

''کبھی نہیں بتاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''مجھے پتہ ہے تم امی کو بتادوگی۔ وہ ابو کو۔ اور یوں ابو اُس تک پہنچ کر ہمارا بنا بنایا کام بگاڑ دیں گے۔''

''ویسے مجھے یہ کام بہت خطرناک لگ رہا ہے''۔اُس نے کہا تھا۔

''مجھے بھی پہلے بہت ڈر لگ رہا تھا۔مگر۔۔۔''

کچھ عرصہ یوں ہی گزر گیا۔ پھر——زینیہ اچانک اُسے کچھ الجھی الجھی سی پریشان سی دکھائی دینے لگی۔اُس نے پوچھا تو ٹال گئی۔دوبارہ پوچھا تو غصہ ہوگئی۔کھلتی نہیں تھی بالکل اُس کے سامنے۔ زیب کو اُس لڑکے سے ہی نفرت ہونے لگی تھی۔اُس کی اچھی خاصی بہن کو اُس سے دور لے گیا تھا۔ کہاں کہ وہ سارا سارا دن اُس سے گپ شپ ہنسی مذاق کرتی رہتی۔اور کہاں کہ اب سارا سارا وقت گم سم رہتی۔جیسے آس پاس زیب تھی ہی نہیں۔تلخ ہوگئی تھی۔ چڑچڑی رہنے لگی تھی۔وہ پہلے کی طرح ہنسنے بولنے کی کوشش کرتی۔تو الٹا ڈانٹنے لگتی۔

ایک دن زینیہ کی اُسی دوست نفیسہ نے زیب کو بتایا۔کہ اُس لڑکے نے کسی امیر کبیر لڑکی سے دوستی کرلی ہے۔اور زینیہ سے کترانے لگا ہے اب۔ اِسی بات پر زینیہ اُس سے لڑی تھی۔تو اُس نے اُسے جواب میں کہا۔کہ غلطی اُسی کی تھی کہ ایک مڈل کلاس لڑکی سے دوستی کرلی تھی۔ بعد میں بے شک کہ صلح ہوگئی دونوں کی۔لیکن میں نے زینیہ سے کہا۔کہ بس کرے۔وہ sincere نہیں ہے اُس کے ساتھ۔مگر پھر بھی وہ اُسی کو پوجتی ہے۔میرا دل چاہتا ہے اُس لڑکے کو خوب کھری کھری سناؤں۔ مگر یہ اتہ پتہ دے تو کچھ کروں نا۔نام تک نہیں بتاتی۔۔۔''

اور——زیب کو اُسکی پریشانی اور الجھن کا پتہ چل گیا۔زبان کھول ہی لی۔

'زینیہ بس کرو۔تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور لڑکی سے دوستی کرکے اُس نے تمہاری انسلٹ کی ہے۔تمہیں مڈل کلاس کا طعنہ دیا ہے۔۔۔'

'پھر نفیسہ نے کان بھرے ہیں'۔

'سچ بتایا ہے۔کان نہیں بھرے'۔

'بکواس کرتی ہے وہ۔اُس نے کسی اور لڑکی سے دوستی نہیں کی۔ مجھے ہی غلط فہمی ہوئی تھی'۔

اور یوں—— وہ پھر خاموش ہوگئی۔اُس کو سمجھانا فضول تھا۔

وہ امی ابو سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ عجیب گومگو میں تھی۔ ہاں — اُس لڑکے سے اُسکی نفرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

دن یوں ہی گزرنے لگے۔ ایک دن زینیہ نے اُسے بتایا کہ وہ لڑکا کل صبح کی فلائیٹ سے بیرون ملک جارہا ہے۔ اور وہ اُسے سی آف کرنے اُس کے ساتھ ائیر پورٹ جائے گی۔ چونکہ ائیر پورٹ جانے کا ٹائم بہت سویرے اور odd سا ہے۔ اِس لئے وہ امی ابو کو یہ کہہ کر جارہی ہے کہ اُس کی کلاس ٹرِپ پر جارہی ہے۔ اِس لئے وہ بہت سویرے نکلے گی گھر سے۔

'تم بھی ایسا ہی کہنا'' اُس نے کہا۔

'کیا ضروری ہے کہ تم ائیر پورٹ ہی جاؤ۔ فون پر بھی رخصت کرسکتی ہو'۔

'نہیں نا۔ بُرا مان جائے گا وہ'

کتنی مجبور تھی وہ اُس سے۔ اُسے غصہ آگیا۔

'اور پھر واپس تم اُس کے ڈرائیور کے ساتھ کالج آؤ گی؟'

'ہاں'۔

''اور امی ابو کو پتہ چلا کہ تم کبھی اُس کے ساتھ اور کبھی اُس کے ڈرائیور کے ساتھ اکیلی گھومتی پھرتی ہو تو؟

'صرف دو بار اُس کے ساتھ گئی ہوں بس۔' اُسنے اپنی صفائی دی۔

'I hate this boy.' کہتے کہتے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اور پھر — اگلے دن پروگرام کے مطابق وہ بہت سویرے گھر سے نکل پڑی۔ بظاہر کالج جانے کے لئے معمول کی طرح پیدل بس سٹاپ کی طرف چل دی۔ وہاں سے اُسے اُس لڑکے نے پک کرنا تھا۔ اُس نے پک کرلیا۔ مگر —

کچھ ہی دور جا کر اُس کی گاڑی کا ایک ٹرک کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ تو صرف زخمی ہوا۔ ہوسپٹل لے جایا گیا لیکن — زینیہ ختم ہوگئی۔ ایک فلرٹ امیر زادے پر قربان ہوگئی!

ایک قیامت ٹوٹی تھی اُن پر۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ کہ زینیہ اُن کو چھوڑ کر وہاں چلی گئی تھی۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہیں آتا!

اُن دنوں آصفہ بھی پاکستان اُن کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اُس نے بھی اپنی خالہ زاد بہن کی دلخراش موت دیکھی تھی۔ بلکہ وہ ہی ابو کے ساتھ جائے حادثہ پر گئی تھی۔ زیب اور امی میں تو جانے کی سکت ہی نہیں تھی۔

خاصے دن گزرے۔ ہوش وحواس نے کام کیا۔ تو اندازہ ہوا۔ وہ بہت ادھورے ہوگئے تھے۔ کم ہوگئے تھے۔ صرف تین رہ گئے تھے!

'زینیہ کی زندگی نہیں تھی سو چلی گئی۔ اُس لڑکے کی زندگی تھی تو صرف زخم آگئے'۔۔۔ بارہا کہی بات اُس دن ابو نے پھر دہرائی۔

'ڈرائیور بھی مرتے مرتے بچا ہے۔۔۔' امی بھی یہ بات پہلے کئی بار کہہ چکی تھیں۔

'اسی لئے تو کہتا ہوں میری زینیہ کی ہی اور زندگی نہیں تھی۔ ورنہ ڈرائیور تو آگے بیٹھا تھا۔ وہ لڑکا بھی۔ زینیہ تو پیچھے بیٹھی تھی۔ نقصان تو اُن کا ہونا تھا۔ مگر اُن کی زندگی تھی اِسلئے وہ بچ گئے۔ زینیہ کی نہیں تھی بس چلی گئی۔ کہتے کہتے ابو رو دیئے۔

'ہائے کون سی منحوس گھڑی تھی جب زینیہ نے ٹرِپ پر جانے کی ٹھان لی تھی۔ ٹرپ کمبخت پر ہی لیٹ ہونے کے ڈر سے لفٹ مانگی ہوگی اُس نے۔۔۔' امی بین کرنے لگیں۔

کِس سے لفٹ لی تھی؟ اور کیوں لی تھی؟ صرف زیب اور آصفہ جانتی تھیں دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

اُس کی بہن چلی گئی تھی۔ اُس کے ماں باپ زندہ درگور ہوگئے تھے۔ وہ اکیلی رہ گئی تھی اور — زینیہ کی دوست نفیسہ نے کچھ عرصہ بعد اُسے بتایا تھا کہ اُسے کسی سے پتہ چلا تھا کہ زینیہ کے فلرٹ کی اُسکی مرضی سے اپنی کسی کزن کے ساتھ منگنی ہوگئی تھی۔

وہ بھول جانا چاہتی تھی سب۔ مگر —

بھول نہ پاتی تھی!

کبھی الجھی الجھی سی پریشان سی اور کبھی کھوئی کھوئی سی اُداس سی زینیہ اُسکی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ کیونکہ اُس کے پلے بوائے نے کسی اور لڑکی سے دوستی کرلی تھی۔ زینیہ تلخ اور چڑچڑی ہوگئی تھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے سب سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ اُسے پتہ تھا کہ وہ کسی اور میں دلچسپی

لے رہا تھا۔ اِس کے باوجود حقیقت ماننے کو تیار نہیں تھی۔ جب اُس نے اُسے اُس کے ساتھ ائیر پورٹ جانے سے منع کیا تھا تو——

'نہیں نا۔ بُرا مان جائے گا وہ' ۔اُس کی آواز میں کچھ کھو دینے کا ڈر تھا۔

جیسے وہ نہ گئی۔تو وہ چھوڑ دے گا اُسے۔اُس کی بات میں وہ مضبوطی نہ تھی۔ جو ایک چاہی جانے والی لڑکی کی بات میں ہوتی ہے۔لگتا تھا وہ لڑکا نہیں صرف زینیہ ہی اُس کی عاشق تھی!

اُسے اپنی بہن کی کم مائیگی کا بھی خیال آتا۔ وہ امیر تھا۔اور اُسکی بہن ایک معمولی گھرانے کی لڑکی۔تبھی تو اُس نے اُسے مڈل کلاس کا طعنہ دیا تھا۔شاید زینیہ کالج آتے جاتے کسی لمبی چوڑی شوفر ڈریوَن گاڑی سے اُترتی تو وہ ایسا نہ کرتا۔

یہاں آکر وہ خود پر قابو نہ پاتی۔ اکثر سوچتی کسی طرح اُسکا پتہ چلائے، اُس کے پاس جائے۔اور اپنے دل کا سارا غبار اُس پر نکال لے۔اُس سے کہے۔کہ اُسکی بہن کو اُسی نے مارا تھا۔قتل کیا تھا اُسکا۔مگر پھر سوچتی——

کہ بات بڑھ نہ جائے۔اب تو صرف چند رشتہ داروں کے ہی چہروں پر یہ سوال تھا کہ وہ منہ اندھیرے گھر سے اکیلی کیوں نکلی تھی؟ کس سے لفٹ لی تھی؟ کیوں لی تھی؟

وہ لڑکا بھی آگے سے ڈھیٹ بن کر شور مچاتا اور کہتا کہ اُسکی بہن ہی کیوں آئی تھی اُس کے پاس؟ تو بات اتفاقاً لفٹ لینے سے چل کر کسی لڑکے کے ساتھ ملنے جانے تک جا پہنچتی۔اور یہ سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی!

وہ اپنی جان سے زیادہ پیاری بہن کو موت کے بعد بدنامی کے غار میں نہیں دھکیلنا چاہتی تھی۔

اُس کے بعد اُس نے اپنے ہونٹ سی لئے۔دل میں البتہ درد ضرور اُٹھتا تھا!

''اُٹھو شاباش۔'' وہ آصفہ کی آواز پر چونکی۔''منہ دھو لو۔میں تمہارے لئے جوس لیکر آتی ہوں۔''

دونوں ہی اندر چل دیں۔منہ دھویا۔اور جوس پیا۔تو اُسکی طبیعت خاصی بحال ہوگئی۔

رات کو زیب، آصفہ اور کاشف برائیٹن مرینہ میں سمندر کے پانیوں میں لگی جگمگ جگمگ کرتی بڑی ساری بوٹ میں ڈنر کے لئے آ گئے۔

موٹی موٹی رسیوں سے پانی میں فِکس کی گئی یہ بوٹ—— یہاں کا مشہور چائنیز ریسٹورانٹ 'The Pagoda Restaurant' تھا

چائنیز ڈیکوریشن، چائنیز عملہ، چائنیز ڈشز—— چائنا چھا گیا تھا جیسے پورے ماحول پر!

وہ لوگ پانی میں دھیرے دھیرے ہلکورے لیتے 'پگوڈا' میں مزے لے لے کر کھانا کھانے لگے۔

واپس جانے لگے تو خالہ اور خالو کے لئے بھی کھانا پیک کروا لیا۔

رات حسب معمول تینوں کزنز آصفہ کے بیڈروم میں گپ شپ کرتے اور کوفی پیتے رہے۔

پھر——

کاشف کمرے میں سدھار گیا۔اور آصفہ اور زیب اپنے اپنے بستر میں گھس گئیں۔

دن بھر کے بوجھل بادل رات کھل کر برسے تھے۔آج کوبالٹ بلو آسمان شفاف تھا۔کیا ہری بھری پہاڑیاں، کیا گرے ڈھلانی چھتوں والی پرکشش آبادی اور کیا سمندر کی چمکتی دمکتی لہریں — سبھی سورج کی سنہری کرنوں سے منور ہو رہے تھے۔

اِس ویک اینڈ پر وہ لوگ شہر سے باہر فارمز پر آئے تھے۔

تاحدِ نگاہ پھیلے باغات تھے۔پھلوں کے، سبزیوں کے، یہاں لوگ اپنی مرضی سے اپنی پسند کے تازہ پھل اور سبزیاں خود توڑ کر خریدتے تھے۔فارمز اپنی سپیشل اوپن ٹرین ٹائیپ گاڑیاں لوگوں کو مطلوبہ جگہ تک لے جاتی اور واپس لاتی تھیں۔

وہ لوگ بھی ریسپشن کے پاس سے فراہم کی گئی ٹوکریاں ساتھ لیتے کیرج میں بیٹھ کر آگے

جاتے ہوئے سٹرابریز کے کھیت کے پاس اُتر گئے۔پھر — تازہ تازہ پکی پکی سٹرابریز توڑتے گئے اور اپنی اپنی ٹوکریوں میں ڈالتے گئے۔

وہیں کچھ فاصلے پر سنگین خان اور اُس کا پڑوسی دوست ڈاکٹر ضیاء بھی فارمز کی کیرج سے اُترتے ہوئے اُسی طرف بڑھنے لگا۔

سٹرابریز کا تو بہانہ تھا۔اِس سے زیادہ وہ دونوں دور دور تک پھیلے پھلوں اور سبزیوں سے لدے خوبصورت فارمز کی سیر کرنے آئے تھے۔

ویک اینڈ تھا۔بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔وہیں سنگین خان نے دیکھا۔زیب تھی۔اُس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت شاید اُسکی خالہ تھی اور وہی لڑکا جس کو اُس نے اپنی بوٹ کی موورنگ پر کشتی باندھتے دیکھا تھا، شاید اُسکا کزن تھا۔سب سٹرابریز کے کھیت میں گھوم پھر رہے تھے۔

''یار وہ دیکھو کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔'' اچانک ڈاکٹر ضیاء سخت ایکسائیٹڈ سا بولا۔''And I bet کہ وہ پاکستانی ہے۔۔۔''

سنگین خان نے دیکھا۔اُس کا اشارہ زیب ہی کی طرف تھا۔

اُس کی اِس قدر ایکسائیٹمنٹ پر اُسے ہنسی آگئی۔

''ہے نا بہت خوبصورت؟'' وہ پھر بولا۔

''ہے تو''۔اُس کے بے پناہ حسن سے وہ مکر نہیں سکتا تھا۔قطار در قطار سٹرابریز سے لدے پودوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

''لیکن اُس کے ساتھ تو پوری فیملی ہے۔'' ڈاکٹر ضیاء کچھ مایوس سا بولا۔

''تمہارا مطلب کیا ہے؟''

"Yaar I want to make friends with her."

پتہ نہیں کیوں؟ سنگین خان کچھ چپ سا ہو گیا۔

''ہاں۔کوئی راستہ نکالو نا''۔ڈاکٹر نے پھر کہا۔وہ جیسے سٹرابریز بھول بھال گیا تھا!

''اور تمہاری cathy کا کیا بنے گا؟'' اُس نے اس کی موجودہ گرل فرینڈ کا کہا۔

اُسے جیسے ڈاکٹر کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔ Cathy اُسکی دوسری گرل فرینڈ تھی۔ پہلی والی بھی ڈاکٹر کی اِنہی عادتوں کی وجہ سے اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

''یار وہ تو میں یوں ہی بس۔۔۔''

''اچھا Cathy بس یوں ہی ہے؟''

''ہاں۔ میں تمہاری طرح بے وقوف تو نہیں ہوں کہ یہاں آ کر بھی بغیر کسی گرل فرینڈ کے رہوں۔''

''اچھا بیٹھو اب۔'' موٹی موٹی سٹرابریز نظر آتے ہی اُس نے ڈاکٹر کو بیٹھنے کو کہا۔

''یہاں نہیں۔ اُس طرف۔'' اُس نے زیب کے قریب والی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں تو یہیں سے توڑوں گا۔ تمہاری اپنی مرضی۔''

اُس نے ڈاکٹر سے ٹوکری لی۔ اور وہیں بیٹھ گیا۔ جانے کیوں کچھ برہم برہم سا بھی نظر آ رہا تھا۔

مجبوراً ڈاکٹر کو بھی بیٹھنا پڑا۔

''جیسا نام ویسا کام۔'' ڈاکٹر بڑبڑایا۔ ''صحیح نام رکھا ہے تمہارا تمہارے گھر والوں نے۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر بھی پسیجتے نہیں ہو۔ سچ مچ پتھر کے بنے ہو۔''

سنگین خان کو ہنسی آ گئی۔

''میرا نام سنگین ہے۔ سنگدل نہیں۔ سنگین کا مطلب ہے۔

strong, daring,—not brute."

''اچھا بس۔ توڑو سٹرابریز۔'' ڈاکٹر ناراض ناراض سا بولا۔

دونوں سٹرابریز توڑ توڑ کر ٹوکری میں جمع کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد سنگین خان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ جھاڑنے لگا۔

''کیوں؟ بس؟'' ڈاکٹر اب بھی سٹرابریز توڑ رہا تھا۔

''اب بس کرنا چاہیے۔ اور کتنی لے جائیں گے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''تھوڑی سی اور۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ اُسے اچھا لگ رہا تھا۔ تازہ تازہ سٹرابریز توڑنا۔

''ٹھیک ہے۔ تم توڑو۔۔۔'' وہ آس پاس نظریں دوڑانے لگا۔

سامنے ہی چند قدم پر زیب بھی سٹرابریز توڑتی بالکل بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ مسٹرڈ رنگ کے پلین شلوار قمیص پر سفید سلیولیس سویٹر اور کپڑوں سے میچنگ دوپٹے میں وہ واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔

'Yaar I want to make friends with her.' اُس کے کانوں میں کچھ دیر قبل کی ڈاکٹر کی بات گونجی۔

اُسکی بات اُسے تب بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ اِس وقت بھی اچھی نہیں لگی۔

کیوں؟ شاید اِس لئے کہ وہ زیب کو جانتا تھا۔ اور اپنی جان پہچان کی لڑکی کے لئے وہ ڈاکٹر کے غیر ذمہ دارانہ لب و لہجے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ نا ہی اُس کے غلط اِرادوں کا حامی ہو سکتا تھا!

معاً — زیب کی نظریں اُٹھیں۔ اور — سنگین خان پر پڑ گئیں۔

لمحہ بھر کو جیسے دیئے سے جل اُٹھے زیب کی آنکھوں میں۔ پھر فوراً نظریں دوسری طرف کر لیں۔

نہ سنگین خان نے اُسے greet کیا۔ کہ اُس کے ساتھ اُسکی فیملی تھی۔ نا ہی زیب نے اُسے 'ہیلو' کہا۔ کہ اُس کے ساتھ اُس کا دوست تھا۔ یہ ہی مشرق تھا۔ یہی مشرقیت تھی!

ہاں — اُس کی آنکھوں میں جلتے دیئے سنگین خان کو کچھ کہہ گئے۔ ایسا کہ —

اُسے اپنی بات کا جواب مل گیا۔ تھوڑی دیر قبل جو اُسے ڈاکٹر کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ سمجھ میں آ گیا!

وہ اُس کی جان پہچان کی لڑکی تھی۔ اِس لئے ڈاکٹر کے لب و لہجے اور اُس کے ساتھ اُس کی دوستی کرنے کا اِرادہ اُسے اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ بھی صحیح تھا مگر —

اُسکی بات سن کر وہ جو چپ سا ہو گیا تھا۔ اپنی 'چپ' کی اُسے وجہ سمجھ میں آ گئی!

اُس کے پُرکشش لب ہولے سے متبسم ہوئے — وہ شاید اُسے پسند کرنے لگا تھا!

جب سے اُس کے بال اُس کے کوٹ کے بٹن میں اٹکے تھے۔ جن کو وہ نہایت احتیاط سے

الگ کررہا تھا۔ اور جن کو اپنی فیملی کے دیکھ لینے کے خوف سے اُس نے بیدردی سے نوچا تھا۔ یہ منظر بارہا اُسے تنہائی میں ستانے آجاتا تھا۔

برائیٹن پیئر پر اُسے دیکھا تھا۔ تو چہرے پر لالی سی بکھر گئی تھی۔ سیاہ خمیدہ پلکیں جھک گئی تھیں۔ بلکہ — بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ اور اب —

اُسکی آنکھوں میں جلتے دیئے اُسے سب کہہ گئے!

کیا وہ خود سے واقف تھی؟

پر — وہ بھی تو خود سے واقف نہیں تھا۔ ابھی ابھی پتہ چلا تھا اُسے!

ایک دلآویز مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔

''ہو گیا۔ چلیں خان صاحب۔''

سٹرابریز کی ٹوکری ہاتھ میں لئے ڈاکٹر اُٹھ کھڑا ہوا۔ تو وہ چونکا۔

دونوں فارمز کی آتی جاتی گاڑیوں میں سے ایک میں بیٹھے۔ اور واپس ریسپشن کی طرف چل دیئے۔

زیب، نازیہ خالہ، آصفہ اور کاشف سٹرابریز توڑ چکے۔ تو دوبارہ کیرج میں بیٹھ کر سبزیوں کی طرف آ گئے۔

مٹر، گوبھی، ہرا پیاز — چاروں اَور تازہ سبزیوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ اِس سے پہلے وہ کبھی سبزیوں کے کھیت میں نہیں گئی تھی۔ آج پہلی بار تھی۔ مٹر توڑتے توڑتے وہ نہال ہو رہی تھی۔

ٹوکریوں میں سبزیاں بھر کر وہ لوگ ایکبار پھر کیرج میں بیٹھے، ریسپشن کے قریب آ کر اُترے، پے منٹ کی۔ اور —

پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گھر کی راہ لی۔

موسم آج بھی بہت پیارا تھا۔ دائیں جانب سمندر تک پھیلے خوبصورت گھر دھند میں دھندلے نظر آرہے تھے۔ دور اُس پار سمندر کہر میں ڈوبا نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ شفاف نیلے امبر پر سورج دیوتا کا راج تھا۔ اور — ہوا بہت تیز تھی!

زیب آج پھر خالہ سے گروسری کی لسٹ لئے ٹاؤن سینٹر جانے کے لئے گھر کے سامنے کا فٹ پاتھ طے کرتی، بائیں جانب پگڈنڈی پر چڑھتی، اوپر بس سٹاپ کے لئے رواں دواں تھی۔

وہ سب کے ساتھ ہوتی یا اکیلی، اِس اجنبی ملک میں چلتی پھرتی بچوں کی طرح خوش ہوتی۔

آج بھی بس ٹاؤن سینٹر میں اپنے سٹاپ پر رُکی۔ تو وہ خوشی خوشی اُتر گئی۔

انڈے ڈبل روٹی وغیرہ تو گھر کے پاس والے چھوٹے سے سٹور سے بھی مل جاتے تھے۔

مگر باقی چیزوں کے بہانے وہ تقریباً روزانہ ہی گھر سے بس میں نکل پڑتی تھی۔ کہیں صرف ونڈو شوپنگ کرتی تھی۔ کہیں دکانوں کے اندر جا کر مطلوبہ چیزیں خرید لیتی تھی۔ وَن پاؤنڈ شوپ تو سب کی طرح اُسکی بھی پسندیدہ دُکان تھی۔

اِس وقت بھی وہ اُسی دکان میں گھوم پھر کر اپنے اور امی ابو کے لئے چیزیں خرید رہی تھی۔

تبھی — وہ چونکی۔ ایک جوان آدمی بھی اُس کے قریب ہی چیزوں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ پاکستانی لگتا تھا۔ پر —

جیسے دیکھا تھا اُسے کہیں!

اوہ — وہی تھا۔ جو اُس دن فارمز میں سنگین خان کے ساتھ تھا۔ کوئی دوست تھا اُسکا غالباً۔

بہر حال — چیزیں اکٹھی کر کے وہ کاؤنٹر پر آئی۔ پے منٹ کی۔ اور دکان سے باہر نکل آئی۔

تمام کام نمٹا کر وہ حسبِ معمول پیزا کھانے ایک چھوٹے سے ریسٹورانٹ میں آ گئی۔

یہاں ہر قسم کی پیزا مل جاتی تھی۔ چکن، بیف، مشرومز، ویجیٹیبل جو بھی دل چاہے۔ گرم گرم اور جس قسم کے بھی جتنے بھی پیس چاہئیں لے سکتے تھے۔

اُس نے چکن پیزا آرڈر کی۔ اور سامنے ریسٹورانٹ کے فُل گلاس دیوار کے پاس لگی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔

ابھی انتظار کر ہی رہی تھی کہ —

وہی آدمی اُسکی ٹیبل کے پاس چلا آیا۔

"May I join you?" اُس نے کہا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دے۔ کہ وہ خود ہی اُس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ پاکستانی ہیں۔ اِس لئے میں چلا آیا۔'' وہ مزید بولا۔

وہ خاموش رہی کہ اُس کا بہانہ معقول تھا!

پھر — زیب کے نہ چاہتے ہوئے بھی، اُس سے باتیں کرنے لگا۔

وہ سخت اَن ایزی محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ اجنبی مردوں کے ساتھ بات چیت، میل جول کی بالکل عادی نہیں تھی۔ 'ہوں'، 'ہاں' میں اُسکی باتوں کا جواب دیتی وہ بے چینی سے اپنی پیزا تیار ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

''میں ذرا کاؤنٹر پر پتہ کر آؤں۔'' وہ پیزا کا پتہ کرنے کا بہانہ کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

کاؤنٹر تک گئی۔ پتہ کیا۔ واپس آئی۔ وہ اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔ اب البتہ کوفی کا کپ تھا اُس کے سامنے۔ شاید آتے وقت آرڈر کیا تھا۔

بادِلِ نخواستہ وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

وہ پھر باتیں کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی۔ اور — اُسکی بے پناہ خوبصورتی کی!

معاً — اُس نے دیکھا۔ سنگین خان اندر داخل ہوا۔

کاؤنٹر پر کچھ آرڈر کیا۔ اور ایک — چبھتی سی نظر اُن دونوں پر ڈالتا پرلی طرف ایک میز پر جا بیٹھا۔

جانے کیوں؟ زیب گھبرا سی گئی۔ اُسکی نظریں ہی کچھ ایسی تھیں۔

کچھ کاٹ سی لئے، کچھ تنبیہہ سی لئے!

وہ اپنی پیزا لے آئی تھی۔ آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔

ڈاکٹر ضیاء کی سنگین خان کی طرف پیٹھ تھی۔ اُس کی موجودگی سے بے خبر وہ اب بھی اُس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔

سنگین خان گاہے گاہے ایک اچٹتی نظر اُن کی ٹیبل پر ڈال لیتا۔ اور —

اُسکی نظروں کی تپش ہی ہوتی تھی شاید کہ اُسی لمحے غیر ارادی طور پر زیب کی بھی نظریں اُس طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ کچھ سٹپٹا کر وہ نظریں دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔

ڈاکٹر شاید کافی بول چکا تھا۔ اپنی کوفی بھی ختم کر لی تھی۔ بادِلِ ناخواستہ زیب سے اجازت لی۔ اور اُٹھ کر چلتا بنا۔

تبھی — سنگین خان اپنی کوفی کا کپ ہاتھ میں لئے اُسکی ٹیبل پر آ گیا۔

''ہیلو میم۔'' وہ آرام سے کرسی کھینچتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''ہائے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

اُسے ماننا پڑ رہا تھا کہ وہ اُس کی ریسٹورانٹ میں موجودگی سے خوش تھی۔ اُس کی ٹیبل پر آیا تھا۔ تو مزید خوش ہوئی تھی اور ——

اُس نے جو خود سے وعدے کئے تھے کہ اُسے دوبارہ نہیں ملے گی، سب ڈانواں ڈول ہوتے نظر آئے مگر۔۔۔

اس کا انجام کیا ہونا تھا؟ سوچ کر ہی وہ دہل گئی۔ وہ ایک عام سی لڑکی اور سنگین خان ایک امیر گھرانے کا چشم و چراغ!

''میں۔۔۔بس جانے ہی والی تھی۔۔۔'' سنگین خان نے اپنا کپ منہ سے لگایا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔

سنگین خان کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرایا۔ ساتھ ہی آنکھوں میں قہر سا اُتر آیا۔

''اتنی دیر جانے کا خیال نہیں آیا۔ میں آ گیا تو جانے کی پڑ گئی''۔ اُس کے بظاہر آہستہ سے لب و لہجے میں چھپی دھاڑ سی تھی، چنگھاڑ سی کہ ——

وہ کافی دیر سے ڈاکٹر ضیاء کی اُس کے ساتھ بیٹھنے اور باتیں کئے جانے کو دیکھتا آیا تھا۔

وہ سہم سی گئی۔ بات تو وہ ٹھیک کر رہا تھا۔ اتنی دیر اُس نے جانے کا نہیں سوچا۔ جوں ہی وہ پاس آیا۔ اُسے جانے کی پڑ گئی۔ پر ——

اُسے کیا معلوم تھا؟ کہ وہ کیوں اُس سے دور بھاگنا چاہتی تھی؟ وہ ایک اور زینیہ نہیں بننا چاہتی تھی!

وہ خاموش رہی۔ بولی کچھ نہیں لیکن —— اُٹھی بھی نہیں کہ ——

سنگین خان کے آس پاس کی فضا تک قہر و غضب میں ڈوبی لگ رہی تھی!

''کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟'' وہ اپنا پارہ قدرے نیچے لاتے ہوئے بولا۔

''کوئی خاص نہیں''۔ وہ مختصراً بولی۔

کوفی کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ شیشے کے اُس پار دیکھنے لگا۔

''کوئی عام تو بولا ہوگا؟'' وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو رہا تھا۔

''بس۔۔۔یہی کہ میرا سیل نمبر کیا ہے؟ لینڈ لائن نمبر کیا ہے؟ وغیرہ۔۔۔''

وہ چونکتے ہوئے اُسے دیکھنے لگا۔

''پھر؟ تم نے نمبر دیئے؟''

''نہیں''۔ اُس کے چونکنے کے انداز پر اُس نے اپنی ہنسی بمشکل روکی۔

''تو؟'' وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''کچھ نہیں''۔ اُس نے خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔

وہ مسکرا دیا۔ دلآویزی سے۔

اب اُس کے چہرے پر کچھ دیر قبل کی تندی نہ تھی۔

''اچھا —— مجھے تو اپنا سیل نمبر دو''۔ وہ بالکل یوں بولا۔ جیسے اُس کو تو نمبر لینے کا جائز حق تھا!

''میرے پاس سیل نہیں ہے''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اپنا سیل دھیرے سے اپنے ہینڈ بیگ میں سرکا دیا۔

اور —— سنگین خان نے اُسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا!

''اچھا لینڈ لائن تو دو۔'' انجان بنتے ہوئے اُس نے کوفی کا آخری گھونٹ لیا۔

''ہمارے گھر میں فون نہیں ہے۔'' وہ پھر بولی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ سب سمجھ رہا تھا۔

''او کے —— ای میل ایڈریس؟''

''وہ بھی نہیں ہے۔'' اُس کی بہت خوبصورت آنکھوں میں شرارت سی تھی۔

سنگین خان نے گہری سانس لی۔

''تم تو ہو نا؟ یا تم بھی نہیں ہو۔''

وہ بے اختیار ہنس دی۔ کھلکھلا کر۔

اُس کے دانت بہت خوبصورت تھے۔ حسین ترین سمائل تھی اُس کی۔

''یہی سب کچھ تم نے اُس ڈاکٹر سے بھی کہا؟''

''ہاں۔''

''اسی انداز میں؟'' کہ — اُس کا انداز Killing تھا!

نہیں — اُس نے اس انداز میں اُس سے بات نہیں کی تھی۔ اس انداز میں تو اُس نے اس سے پہلے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔ پتہ نہیں سنگین خان کے ساتھ کیوں اس انداز میں بات کی؟

شاید — اچھا لگتا تھا وہ اُسے!

ایکبار پھر — اُسے خیال آیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا!

''اب۔۔۔ میں جاؤں؟''

''نہیں'' وہ بڑے تحمل سے بولا۔ ''مجھے میری بات کا جواب دو۔''

''کون سی بات؟'' وہ انجان بن گئی۔

تم نے اُسے اسی انداز میں نمبرز ریفیوز کیئے تھے؟'' اُس نے پھر دہرایا۔

''نہیں'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''میں نے ہر بار یہی کہا کہ میں کسی کو اپنا فون نمبر وغیرہ نہیں دیتی۔''

''گڈ''۔ لیکن تم مجھے کیوں نہیں دے رہیں اپنا نمبر؟''

''میں نے کہا نا۔ میں کسی کو اپنا نمبر نہیں دیتی۔''

''تم نے مجھ سے ایسا نہیں کہا۔ تم نے مجھ سے کہا کہ تمہارے پاس سیل فون نہیں ہے۔ تمہارے ہاں لینڈ لائن نہیں ہے۔ اور نا ہی تمہارے پاس تمہارا ای میل ایڈریس ہے۔۔۔''

وہ مسکرا دی۔ دلآویزی سے۔

''بات ایک ہی ہوئی نا۔''

''نہیں۔ بات ایک نہیں ہے۔''

''پھر — کیا ہے؟''

''تم نے جو ڈاکٹر سے کہا۔ وہ الگ بات ہے۔ جو مجھ سے کہا وہ الگ بات ہے۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

زیب سہار نہ سکی۔ سیاہ خمیدہ پلکیں جھک گئیں۔

سنگین خان کو اچھا لگا۔ ہولے سے مسکرا دیا۔

پھر — ایک گہری سانس لی۔

''تمہارا سیل تمہارے بیگ میں ہے۔ تمہارا لینڈ لائن تمہارے گھر میں ہے۔ اور — تمہارا — ای میل ایڈریس بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے — بہتر ہوگا کہ تم چپ چاپ مجھے اپنا سیل نمبر دے دو۔''

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اُسے پتہ تھا وہ سب سمجھ رہا تھا۔

''دو شاباش۔''

''نہیں''۔

''دو''۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''نہیں''۔ اُس نے پھر دہرایا۔

''پلیز!''

وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

کیسے دے اُسے نمبر؟

کیوں دے اُسے نمبر؟

''میں گھر جاؤں گی پلیز!'' میں پھر خوفزدہ ہو گئی۔ اٹھنے لگی۔

وہ بھی اُٹھ آیا۔ دونوں اکٹھے ریسٹورانٹ سے باہر آ گئے۔

''گھر تک تو چھوڑ سکتا ہوں نا؟'' وہ کچھ بجھ سا گیا تھا۔

''میں چلی جاؤں گی پلیز!'' اُس نے کہا۔ جبکہ —

وہ کہنا چاہتی تھی۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ اپنے سحر میں مزید نہ الجھاؤ۔ مگر — ایسا کہہ نہ سکی۔

''چلو سیدھی طرح'' اچانک اُس کے لہجے میں تحکم در آیا۔

اور —

وہ سہم سی گئی۔ چپ چاپ ساتھ ہو لی!

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔سنگین خان سڑک پر نظریں جمائے خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔
وہ بھی چپ تھی۔سوچوں میں گم شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔

''ایک بات پوچھوں؟''سنگین خان نے گھمبیر خاموشی توڑی۔

چونکتے ہوئے اُس نے رخ اُس کی طرف کرلیا۔

''پوچھیں۔''

''تم مجھ سے خوفزدہ کیوں ہو؟''

''ن۔نہیں۔میں خوفزدہ تو نہیں ہوں۔''

''تم مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرتیں۔۔۔شروع دن سے ہی۔۔۔''

ایسا ہی تھا۔وہ اُس سے خوفزدہ بھی تھی اور—
اُس پر ٹرسٹ بھی نہیں کرتی تھی۔پھر بھی —

''نہیں۔ایسی بات نہیں ہے''۔اُس نے دھیرے سے کہا۔

''ایسی ہی بات ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔اور—
ایکبار پھر چپ سادھ لی۔

زیب نے دیکھا۔اُس کا پرکشش چہرہ تاریک سایوں کی زد میں تھا۔دلنشیں آنکھیں اَپ سیٹ سی تھیں۔

وہ بھی اَپ سیٹ ہوگئی۔پہلی بار اُسے احساس ہوا۔وہ اُسے پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔

کیوں؟

وہ اپنے دل میں جھانکی۔وہ ہی وہ چھایا ہوا تھا وہاں۔گھبرا کر اُس نے خیال جھٹکا۔وہ پاگل تو نہیں ہوگئی تھی۔اور—

یہ بار بار وہ اُس کے ساتھ گاڑی میں کیوں آبیٹھتی تھی؟ کیا صاف نہیں کہہ سکتی تھی۔کہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔کسی غیر مرد کے ساتھ بات چیت بڑھانا اُسے پسند نہیں تھا۔پر—

وہ چونکی۔یہ جھوٹ تھا۔وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔وہ اُسے غیر نہیں لگتا تھا۔اُس کے ساتھ بات چیت کرنا اُسے پسند تھا۔۔۔

''اچھا۔۔۔تو تم اور ڈاکٹر آج بازار میں گھوم پھر رہے تھے؟''کسی بھی جذبے سے عاری وہ جیسے خاموشی کو توڑنے کی خاطر بولا۔

وہ مسکرادی۔ہولے سے۔

''میں اُس کے ساتھ نہیں گھوم پھر رہی تھی۔''

''اچھا ریسٹورانٹ میں تو ساتھ گئی تھیں نا۔''

''نہیں۔میں اکیلی ریسٹورانٹ میں گئی تھی۔پتہ نہیں وہ کہاں سے آگیا تھا۔۔۔''

''اوہ۔''بازار میں گھومنے پھرنے کی بات تو اُس نے یوں ہی کہہ دی تھی۔مگر ریسٹورانٹ میں اُسے یقین تھا کہ دونوں اکٹھے گئے تھے۔''تو تمہیں دیکھتا ہوا ہی وہ وہاں آیا تھا۔۔۔''

''شاید''۔

''اور میں— تم دونوں کو وہاں دیکھ کر آیا تھا۔''اُس نے شیشے میں سے اُن کا دھندلا سا عکس دیکھا تھا۔خوشگواری سے کہتے ہوئے نہایت سادگی سے اپنی بات تسلیم کرلی۔

وہ اب نارمل ہو رہا تھا۔زیب کو اچھا لگا۔ذہن پر کا گراں بار ہٹتا محسوس ہوا۔اُسے دیکھا۔سنگین خان ایک حقیقت تھا۔ٹھوس حقیقت۔وہ مان گئی وہ اُسے جھٹلا نہیں سکتی تھی!

معاً— اُسے خیال آیا۔زینیہ بھی اسی طرح بے بس ہوگئی ہوگی۔یقین کرلیا ہوگا اُس لڑکے پر۔لیکن— وہ لڑکا اچھا نہیں تھا۔دوسری لڑکی کو اُس پر ترجیح دی تھی۔

مگر — سنگین خان کی کیا گارنٹی تھی۔کہ وہ اُس کے ساتھ Sincere رہے گا؟

اوہ — وہ کہاں پہنچ گئی تھی؟ سنگین خان نے اُسے کب کہا تھا۔کہ وہ اُسے پسند کرتا تھا۔
اور اُس کے ساتھ Sincere تھا یا نہیں؟

کتنی پاگل تھی وہ۔اور—

ایکبار پھر— اُس کا دل چاہا۔بھاگ جائے اُس کے پاس سے۔وہ کون تھا اُس کا؟

اُس کا گھر قریب آرہا تھا۔ایکبار پھر وہ خود سے وعدے لے رہی تھی۔سنگین خان کو نہ ملنے کے!

''یہ میرا سیل نمبر ہے۔''اچانک سنگین خان نے گلووَ بوکس میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ

نکالتے ہوئے اُس کے قریب سیٹ پر رکھا۔ ''جب بھی مجھے بھروسے کے قابل سمجھو۔ فون کر دینا ___''

اُس نے چپ چاپ ایک نظر اُس پر ڈالی۔ پھر کارڈ پر۔ اور پھر ___
سامنے دیکھنے لگی۔

اُس کی سٹریٹ میں آتے ہوئے سنگین خان نے مقررہ جگہ پر گاڑی روکی۔ حسب سابق باہر نکلتے ہوئے اُس کے لیے دروازہ کھولا۔

اُس نے بھی پہلے کی طرح اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اور ___
گھر کی راہ لی۔

پرسوں سے اُس کا دماغ بھنا رہا تھا۔ آج تک کسی لڑکی نے اُسے یوں رد نہیں کیا تھا۔ جیسے زیب نے کیا تھا۔ اُس نے اُسے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا۔ جب وہ گاڑی سے اُتر کر گھر چل دی تھی۔ اور وہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تھا تو ___

اُس کا وزیٹنگ کارڈ وہیں پیسنجر سیٹ پر پڑا اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔
کیا سمجھتی تھی اپنے آپ کو؟

اور ___ اُس نے اُسے اپنا کارڈ ویسے نہیں دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اپنے لیے Longing دیکھتے ہوئے ہی ایسا کیا تھا۔ اس کے باوجود جانے کس آسمان پر رہتی تھی؟

ہر بار اُس سے خوفزدہ سی، بدگمان سی!

ایسی کون سی حرکت کی تھی اُس نے۔ جو وہ اُسے avoid کیے جا رہی تھی؟

سرسبز پہاڑی ڈھلان پر بنے اپنے گھر میں بیڈروم کی چوڑی خوبصورت بالکنی میں بیٹھا کوفی کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اُتارتا وہ آس پاس پر نظریں جمائے تھا۔

اُس کے دائیں طرف سمندر تھا۔ اور سامنے ہی چند قدم پر ڈاکٹر ضیاء رہتا تھا۔

یہاں ایک ہی اینکلوژر میں ایک ہی طرح کے بنے چار گھر تھے۔ آمنے سامنے۔ اِس طرف سنگین خان اور انگریز پیٹر کا اور مقابل میں ڈاکٹر ضیاء اور ایک عرب امیر فہد کا۔

گھروں کے ایک طرف سمندر رواں دواں تھا۔ اور دوسری طرف اُن کی سٹریٹ تھی۔

چاروں مکین اچھے پڑوسی اور اچھے دوست تھے۔ ہاں پاکستانی ہونے کے ناطے ڈاکٹر سے دوستی زیادہ تھی۔

دھوپ ڈھل رہی تھی۔ سیندوری شام سمندر، ساحل اور اُن کے گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی اور — سمندر کے پانیوں کو چومتی ہوا یخ بستہ ہو رہی تھی۔

قدرت کے لازوال حسن پر نظریں ٹِکائے، ذہن پر زیب کے رویے کا بوجھ لیے — وہ اب بھی کوفی پی رہا تھا۔

تبھی اُس نے دیکھا۔ ڈاکٹر اپنے دروازے سے نکلتے ہوئے اُس کی طرف آ رہا تھا۔

اُسے اچھا لگا۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ اُس کا زیب کے آگے پیچھے ہونا اُسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ایک تو یہ ڈاکٹر عیاش ٹائپ تھا۔ دوسرا یہ کہ خود اُس کے ذہن پر بھی تو زیب چھائی ہوئی تھی!

کوفی کا کپ ہاتھ میں لیے لیے ہی وہ نیچے آ گیا۔ دروازہ کھولا۔ اُسے اندر لایا۔

''تم اوپر میری بالکنی مین بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کوفی بنا کر لاتا ہوں۔'' اُس نے اُسے اوپر بھیجا۔

دونوں ہی تھرٹیز میں تھے۔ وہ تیس اکتیس سال کا تھا۔ اور ڈاکٹر تینتیس چونتیس کا۔ دونوں ہی بیچلرز تھے۔ اور دونوں پاکستان میں ایک ہی علاقے سے تھے۔ سو — اچھی بے تکلفی تھی آپس میں!

وہ کچن میں گیا۔ جلدی جلدی ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی فریش کوفی بنائی۔ اور دونوں کپس ہاتھ میں لیے اُس کے پاس بالکنی میں آ گیا۔

''ندیم سے بنوا لیتے کوفی۔'' اُس نے اُس سے کپ تھامتے ہوئے اُس کے قریباً پینتیس چھتیس سالہ گارڈ ندیم کا کہا۔

سنگین خان بھی بیٹھ گیا۔ اپنی کوفی کا کپ درمیان میں رکھی ٹیبل پر رکھا۔

''یار وہ تو میرا گارڈ ہے۔ یہاں بھی میرے بابا اُسے مجھے گارڈ کرنے کے خیال سے ہی ساتھ بھیجتے ہیں۔'' کپ اُٹھاتے ہوئے اُس نے مزیدار کوفی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

یہ حقیقت تھی۔ پاکستان میں بھی گھر سے باہر نکلتے ہوئے دو دو گن مین اُس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اُن ہی میں سے ایک ندیم تھا۔ لیکن اب جب کچھ عرصہ سے بابا کو اُن کے ایک معتمد آدمی نے خبردار کیا تھا کہ سنگین خان کی کِڈنیپنگ کا خطرہ تھا۔ تو بابا نے یہاں بھی ندیم کو ساتھ کر دیا تھا۔ کہ بقول اُن کے کہیں بھی کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ وہ کبھی ندیم کو ساتھ لے کر نکلا نہیں۔ وہاں کیا کم پابندی تھی کہ یہاں بھی آزادی سے چل پھر نہ پاتا۔

''ہاں بھئی۔ قیمتی چیز ہو۔''

''ویسے — ندیم نے ہی گھر کو سنبھالا ہوا ہے۔ میں نے حالانکہ کبھی اُسے نہیں کہا کام کرنے کو۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے گھر کے کام کرنے سے اُس کی کوالٹی خراب ہوگی۔ مگر وہ خود ہی ہر کام کرتا ہے۔ اپنی کوفی اور چائے البتہ میں خود بناتا ہوں۔ کسی اور کے ہاتھ سے تسلی نہیں ہوتی۔''

''بڑے ٹھاٹھ ہیں، یار۔''

''کوئی خاص تو نہیں۔''

''ہمیں دیکھو۔ کام سے تھکے تھکائے آتے ہیں۔ تو خود پکانا شروع ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر گزارا سینڈوچ پر ہوتا ہے۔ اب تو سینڈوچ بھی باسی کھانے لگا ہوں۔۔۔'' وہ مسکراتے کہہ رہا تھا۔

''تو میرے پاس آ جایا کرو نا کھانا کھانے۔''

''کب تک؟''

''جب تک میں یہاں ہوتا ہوں۔''

''تھینک یُو سو مچ یار۔ تیرا کہنا ہی بہت ہے۔ ویسے بھی تیرے یہاں کوئی سپیشل ڈش بنتی

ہے۔تو وہ تو ہم سب کھاتے ہی ہیں۔''

اُس کا اشارہ ندیم کے بنائے مزیدار مٹن پلاؤ اور چکن کڑائی کی طرف تھا۔تب پھر چاروں دوست سنگین خان کے یہاں مل کر کھانا کھاتے تھے۔

یوں ہی گپ شپ کرتے دونوں دوست کوفی پی رہے تھے۔

''سن یار۔'' باتوں کے دوران اچانک ڈاکٹر گویا ہوا۔

''ہوں۔سُنا۔''

''وہ۔۔۔لڑکی ہے نا''

''کون سی لڑکی؟''

''وہی۔۔۔اُس دن فارمز پر جو تھی۔''

زیب پر بے طرح غصہ ہونے کے باوجود اِس وقت اُس کے ہاتھ میں کوفی کا کپ لرز سا گیا۔

وہ چپ رہا۔کوئی جواب نہیں دیا۔

''وہ۔۔۔ملی تھی دوبارہ سٹی سینٹر میں۔۔۔ریسٹورانٹ میں۔۔۔''

اب وہ خاموشی سے دائیں جانب ساحل پر نظریں جمائے تھا۔

''تم سن رہے ہونا؟''

''ہوں — ہاں''۔اُس نے مختصراً کہا۔

''بہت خوبصورت ہے یار۔لڑکی نہیں کوئی اپسرا ہے جیسے۔۔۔''

وہ سچ کہہ رہا تھا۔اُس کی بے داغ گندمی رنگت، حسین نقوش، بہت لمبے خوبصورت بال، بے حد متناسب فگر، لمبا قد— دانت اور سمائل تک غضب کے تھے!

پر— ڈاکٹر کی زبانی اُس کی تعریف اُسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔اِس کے باوجود کہ وہ اُس پر بہت غصہ بھی تھا۔Uncertainity بھی تھی اُس کے بارے میں!

''ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''لیکن عجیب بے حس سی لڑکی ہے۔میں نے سیل فون کا نمبر مانگا۔تو بولی۔میں کسی کو اپنا

نمبر نہیں دیتی۔لینڈ لائن کا نمبر پوچھا۔تو بیزاری سے بولی۔'میں نے کہا نا۔میں کسی کو اپنا فون نمبر نہیں دیتی۔' یار۔۔۔کسی طرح ہاتھ ہی نہیں آتی۔۔۔''

پتہ نہیں کیوں؟ سنگین خان کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔

''میں نے پوچھا۔تم یہاں کس جگہ ٹھہری ہو۔اُس نے یہ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔

ہنہ — یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔دوبارہ کہیں نظر آئی تو I'll follow her up to her house.''۔

''عادی بدمعاش ہو۔'' سنگین خان خوش تھا۔زیب کے اُس کے ساتھ برتاؤ پر۔ خوشگواری سے بولا۔

''یار۔۔۔میں ذرا سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں اِس لڑکی پر۔۔۔''

جانے کیوں — سنگین خان زور سے چونکا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ۔۔۔والدہ اور بہنیں بہت زور دے رہی ہیں شادی پر۔اب تک تو avoid کرتا آیا تھا۔مگر مزید ایسا نہیں لگتا۔میں نے ہمیشہ اُنہیں یہی کہہ کر ٹالا تھا۔کہ مجھے خود کوئی لڑکی پسند آئے گی۔تو بتا دوں گا۔اصل میں یار۔۔۔میں اتنی جلدی پابند ہونا نہیں چاہتا تھا۔پر اب والدہ کہتی ہیں۔کہ تم سے تو پسند ہوتی نہیں۔ہم خود ڈھونڈ دیں گے۔اور یہ کہ اِس سال کے آخر میں ہر حال میں شادی ہو جانی چاہیے۔

اور — اِس سال میں تمہیں پتہ ہے صرف پانچ مہینے باقی ہیں۔۔۔'' سنگین خان کی طرف دیکھتے دیکھتے اُس نے خوشگواری سے بات ختم کی۔

سنگین خان نے کچھ بے کلی سے پہلو بدلا۔

''مگر۔۔۔یہ لڑکی بھی بہت لیے دیئے سی چیز ہے۔میں نے اُسے ڈنر پر انوائیٹ کرنا چاہا۔تو بُرا مان گئی۔۔۔''

سنگین خان ایک بار پھر— بہت خوش ہوا!

دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ڈاکٹر ضیاء کا موضوع زیادہ تر زیب ہی رہی۔کہ وہ جلد سے جلد اُس تک پہنچنا چاہتا تھا۔اپنی ماں بہنوں کو اُس کا رشتہ لینے بھیجنا چاہتا تھا!

''فہد بن عبدالعزیز بن عبداللہ کا کیا حال ہے؟'' باتوں کا رخ بدلنے کی خاطر سنگین خان نے ڈاکٹر کے ساتھ والے اور اپنے مشترکہ عرب دوست کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ یوں ہی اُس کا پورا نام لیا کرتا تھا۔ بہت دن سے نظر نہیں آیا۔''

''مزے میں ہے۔ گرمیوں میں سردی انجوئے کر رہا ہے۔ خوبصورت گوریاں الگ ذہن پر چھائی ہوئی ہیں۔۔۔''

''واؤ۔۔۔ ویسے اُس کا بھی قصور نہیں۔ ففٹیز، سکسٹیز کے ٹمپریچرز میں گھروں میں گھسے ائیر کنڈیشنرز کی سڑاند میں پلتے رہتے ہیں اور۔۔۔ عورت ذات بھی۔۔۔ کم ہی نظر آتی ہے۔۔۔''

''جبھی تو ندیدہ ہے اتنا۔ لڑکی دیکھتا ہے تو بس دیکھتا رہ جاتا ہے۔'' ڈاکٹر ضیاء بولا۔

پہلی بار — سنگین خان کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''یار ندیدہ تو نہیں ہوں نا۔''

''ہاں۔ کافی جہاندیدہ ہو۔'' اُس نے پھر لطیف چوٹ کی۔

''ویسے تم درمیان درمیان میں ہو۔ نہ ندیدے ہو۔ نہ جہاندیدے ہو۔''

''مانتے ہو نا؟''

''کیوں نہیں۔''

دونوں یوں ہی ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ گپ شپ چلتی رہی۔

پھر — ڈاکٹر ضیاء نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب چلتا ہوں یار۔ ضروری کام ہے۔''

دونوں نیچے آئے۔ پھر گھر سے باہر آ گئے۔

سمندر، ساحل اور چاروں گھروں میں روشن بتیاں — سب مل کر ماحول کو پراسرار حد تک خوبصورت بنا رہے تھے۔

''پوچھ سکتا ہوں کہ ضروری کام کیا ہے؟'' سنگین خان نے اُسے ایکبار پھر چھیڑا۔

جبکہ اُسے معلوم تھا۔ کیتھی ویک اینڈز اُسی کے پاس گزارا کرتی تھی۔ وہ ہی اُس کا ضروری کام تھی!

''اس رومینٹک ماحول میں اور کیا کام ہو سکتا ہے۔ کیتھی آنے والی ہے یار۔''

''تم نہیں سدھرو گے۔'' سنگین خان نے کہا۔

''سدھر جاؤں گا اُس لڑکی سے شادی کر لوں گا تو۔''

اور — جاتے جاتے وہ اُسے بے کل کر گیا!

رات ڈنر پر وہ خاصی اُدھیڑ بُن میں مصروف تھا۔ یوں تو وہ زیب پر بہت ناراض تھا۔ آئندہ کوئی لفٹ نہ دینے کا پکا ارادہ کیا ہوا تھا۔ مگر ڈاکٹر سے بات چیت کے بعد سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا تھا۔ وہ زیب کو پسند کرتا تھا۔ بلکہ حواسوں پر چھا گئی تھی وہ تو۔ اُسے کسی اور کے پاس کیسے جانے دیتا؟

پر — زیب بھی تو اُس پر اعتماد نہیں کرتی تھی!

پھر — وہ دھیرے سے مسکرایا۔

کیسے کرے گی اعتماد؟ اُس نے کھل کر اُسے اپنے دل کا حال بتایا بھی تو نہیں!

یہ بھی نہیں پوچھا۔ کہ خود زیب کی آنکھوں میں بھی تو وہ بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔ پھر وہ کیوں گریزاں تھی اُس سے؟

ڈنر کے بعد وہ living room میں ٹی وی دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر — اوپر ڈریسنگ روم میں آ کر کپڑے تبدیل کئے۔ نائیٹ سوٹ پہنا۔ گاؤن اوپر لیا۔

اور — حسب معمول اپنی بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔

ہر سُو سناٹا تھا۔ چاروں گھروں کی بتیاں بند تھیں۔ اور — پورے چاند کی رینا جادو جگا رہی تھی!

دونوں بازو سینے پر لپیٹے بالکنی کے دروازے پر ٹکا جادوگر اطراف پر نظریں جمائے اِس وقت پھر وہ سوچوں میں گم تھا۔

ڈاکٹر ضیاء بھی زیب کے بارے میں سیریس لگ رہا تھا۔ وہ بہت چلتا پرزہ تھا۔ زیب کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا اُس کے لیے کوئی خاص مشکل نہیں تھا۔ اور ایسا کر لیتا تو یقیناً اپنے گھر والوں کو زیب کے یہاں بھیج دیتا۔

کیا کرے وہ؟ ساتھ ہی اُسے اپنے بابا کا خیال آ گیا۔ بے انتہا عقیدت تھی اُسے اپنے بابا سے۔

وہ پانچ چھ سال کا تھا جب امی کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ اُس کی دیکھ بھال کی خاطر رشتہ داروں کی کہہ سن کر بابا نے دوسری شادی کر لی تھی۔ مگر ——

اُس کو تو کیا مما تو بابا کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ عام سے گھرانے سے تھیں۔ پر بابا کی بے شمار دولت دیکھ کر ایسا پینترا بدلا۔ اچانک اتنی ایڈوانس بن گئیں کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ نت نئے لباس، جیولری، میک اپ اور —— کلب اور پارٹیز اٹینڈ کرنا اُن کا روزانہ کا معمول بن گیا۔

لباس نیم عریاں، دوستوں میں مردوں کے ناموں کی شمولیت اور راتوں کو دیر سے گھر آنے لگیں تو بابا نے ٹوکا۔ اُلٹا انہیں دقیانوسی اور جاگیرداری کے طعنے دے ڈالے۔

بابا بہت خوش باش، صلح جُو اور امن پسند واقع ہوئے تھے۔ مگر —— مما کی یہ آزادی اُن کی برداشت سے باہر تھی۔ اُنہوں نے اُنہیں طلاق دینا چاہی۔ مگر پھر رشتہ دار اور دوست آڑے آ گئے۔

بقول بابا اُنہوں نے اُنہیں طلاق نہیں دی۔ مگر —— اُس کے بعد اُن کے ساتھ کوئی تعلق بھی نہیں رکھا۔

اُنہوں نے اُن کے لیے پچھلی طرف الگ اینیکسی بنوالی تھی۔ خود اپنی کوٹھی میں ہی رہنے لگے تھے۔ یوں ایک ہی اینکلوژر میں رہتے ہوئے بھی دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے تھے۔

اُس کے بعد بابا نے کبھی نہیں پوچھا۔ کہ وہ کہاں جا رہی تھیں؟ کہاں سے آ رہی تھیں؟ مما بھی اس میں خوش تھیں۔ ہاں البتہ پیسوں کی ضرورت پڑتی۔ تو بابا کی طرف آ جاتی تھیں۔ بابا چپ چاپ رقم دے دیتے تھے۔ کبھی نہیں پوچھا۔ کہ اتنی رقم وہ کہاں اور کیوں خرچ کرتی تھیں؟

وقت گزرتا رہا۔ اُس کی دیکھ بھال بابا خود اور اُس کی آیا ماما خوش بخت کرتی رہیں۔ مما کو

نہیں، وہ ماما خوش بخت کو ہی ماں کی جگہ سمجھتا رہا۔ بیوی کی جگہ بابا کی خدمت اُن کے پرانے ملازم شکور بابا کرتے رہے۔

بابا اکثر سوچتے۔ کہ اگر سنگین خان کی دیکھ بھال ایک آیا کر سکتی تھی اور —— اُن کا خیال ملازم رکھ سکتا تھا تو اُنہوں نے شاہدہ بیگم سے شادی کی زحمت ہی کیوں کی؟

ایسے میں وہ سنگین خان کی والدہ کو بہت یاد کرتے۔ اُن کے اپنے خاندان کی تھیں۔ شوہر کے رتبے اور گھر کے ناموس کا بہت پاس تھا اُنہیں۔ اُن سے اور اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت تھی اُنہیں۔ مگر ——

ہونی کو کون روک سکتا ہے؟ یہی سوچ کر وہ دھیان بدل دیتے۔

مما کا رویہ سنگین خان کے ساتھ بھی بہت تلخ تھا۔ اُن میں عورت پن کا ہی فقدان تھا۔

وقت مزید آگے بڑھنے لگا۔ اُس نے ایف ایس سی کیا۔ تو بابا نے اُسے انجینئرنگ کرنے برائیٹن بھیج دیا۔ اُس نے انجینئرنگ میں ایف ایس سی کیا۔ اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ برائیٹن سے ہی ایم بی اے بھی کر لیا۔

کچھ عرصہ وہ یہیں برائیٹن میں ایک فرم کے لیے کام کرتا رہا۔ پاکستان بھی باقاعدگی سے جاتا رہا۔ مگر ——

ایک دن بابا نے کہہ ہی دیا۔ کہ اب وہ مزید اُس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت اکیلا محسوس کرتے ہیں خود کو۔ کہ وہ اُن کا بیٹا تو تھا ہی۔ مگر ایک معتمد دوست بھی تھا۔ ہمدم و ہمراز بھی!

سو —— وہ سب چھوڑ چھاڑ اپنے بابا کے پاس چلا آیا۔ اور ——

بابا کے ساتھ بزنس سنبھالی۔ تو اچانک مما بہت مہربان ہو گئیں۔ اُس کے ساتھ ساتھ بابا کا بھی بہت خیال رکھنے لگیں۔

دو چار مہینے بہت اچھے گزرے۔ بابا خوش تھے۔ کہ دیر سے سہی اُنہیں اُن دونوں کا خیال آیا تو!

تبھی —— ایک دن مما سے ملنے اُن کی بھانجی نائلہ لندن سے آ گئی۔

لگتا ہی نہیں تھا۔ کہ لندن میں پلی بڑھی تھی۔ Covered ڈریسز پہنتی تھی۔ بہت بااخلاق

تھی۔ بابا کی مما سے بھی بڑھ کر خدمت کرتی تھی۔ سنگین خان کا بہت خیال رکھتی تھی۔

کون کہہ سکتا تھا کہ وہ مما کی بھانجی تھی؟

دنوں میں ہی سب کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

گھر کا ماحول بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ مما نے گھر سے نکلنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ گھر بار میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ نقشہ ہی بدل گیا تھا جیسے گھر کا!

پھر — ایک دن بابا نے سنگین خان کو بتایا۔ کہ مما چاہتی تھیں کہ وہ نائلہ سے شادی کر لے۔

سنگین خان نے بابا سے پوچھا۔ کہ وہ کیا چاہتے تھے؟ اُس کے لیے اُن کی مرضی زیادہ مقدم تھی۔ نائلہ یا کوئی بھی اور لڑکی — اُس کے لیے سب برابر تھیں۔ کہ نہ اُس کا نائلہ سے کوئی قلبی لگاؤ تھا۔ نا ہی کسی اور لڑکی سے۔ سو اُسے فرق نہیں پڑتا تھا!

مخلص اور سٹریٹ فارورڈ بابا نے نائلہ کے حق میں اپنی مرضی دی اور —

یوں دونوں کی منگنی ہو گئی۔

منگنی سے ایک دو دن پہلے ہی نائلہ اپنی چھوٹی خالہ کے گھر چلی گئی تھی۔ وہیں اُس کی والدہ بھی ٹھہری تھیں۔ اُس کی شادی کرا دینے کے خیال سے ہی وہ لوگ وطن آئی تھیں۔ منگنی کا اہتمام بھی خالہ کے گھر سے ہی ہوا تھا۔ پھر نائلہ وہیں رہ گئی تھی۔ بقولِ مما نائلہ نے اب شادی تک اُس سے پردہ کرنا تھا۔

اُسے مما کی یہ بات اچھی لگی تھی۔ زیادہ میل جول وہ خود بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ کہ نہ وہ ٹین ایجر تھا۔ نا ہی اتنا بے صبر۔ منگیتر تھی، شادی ہو ہی جانی تھی۔ ہاں فون پر کبھی کبھی بات ضرور ہو جاتی تھی۔

دن یوں ہی گزرتے رہے۔

ایک دن وہ اپنے دوست کے ساتھ میریٹ میں بیٹھا ڈنر کر رہا تھا۔ کہ —

نظر دروازے کی طرف اُٹھی۔ نائلہ اور ایک لڑکا اندر داخل ہوئے۔

اُس نے نائلہ کو بمشکل پہچانا۔ کیپری پینٹس اور سپگیٹی سٹریپ بلاؤز پہنے وہ بالکل ہی کوئی اور لڑکی لگ رہی تھی۔

اُس لڑکے کے ساتھ وہ ایک کونے والی ٹیبل پر جا بیٹھی۔

وہ بہت بے کل ہو رہا تھا۔ کھانا کھاتے نظریں اُن کی طرف اٹھ جاتیں۔ یہ نائلہ کی خالہ کا بیٹا یا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ اُن سب سے وہ مل چکا تھا۔ پھر —

کون تھا؟

اور — دونوں کھانا کھا کر اٹھے۔ لڑکے نے بہت Casually اُس کی ننگی کمر میں ہاتھ ڈالا۔ ساتھ ساتھ لئے دروازے سے باہر نکلا۔ تو —

وہ سمجھ گیا۔ وہ کون تھا؟

دوست کو ڈراپ کر کے وہ گھر آنے لگا۔ تو سخت الجھا الجھا تھا۔

نائلہ کو تو وہ اُسی لمحے ہی ذہن سے نکال چکا تھا۔ مگر — بابا سے کیا کہے گا؟ مما کا کیا ردِعمل ہوگا؟

یہ تو وہ سمجھ ہی گیا۔ کہ کچھ عرصے سے مما اُس پر اور بابا پر کیوں مہربان ہو گئی تھیں۔ نائلہ اپنے اوپر پوری مشرقیت طاری کئے کیوں اُن باپ بیٹے کے آگے پیچھے ہو رہی تھی؟

مما اور اُن کی بھانجی، بابا اور اُسکی خدمت گزار اور وفا شعار بیویاں بن کر گھر کو جنت بنا دیں گی۔ یہ خیال دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔ لیکن —

بابا — کیا وہ یہ سب سہہ سکیں گے؟

نائلہ کی تو خیر کوئی بات نہیں تھی۔ کیا بابا مما کا اوڑھا اچھی بیوی کا لبادہ تار تار ہوتے برداشت کر پائیں گے؟

اُنہیں تو مدتوں بعد بیوی کا سکھ میسر آیا تھا۔ ایکبار پھر چھن جانے پر کیا وہ سہار پائیں گے؟

اگر اُس نے بابا کو یہ سب بتا دیا۔ تو سب تہس نہس ہو جائے گا۔ عرصہ بعد انہیں خوش دیکھا تھا۔ نائلہ کے لئے حامی بھی صرف اور صرف بابا کی خاطر بھری تھی۔

کیا ایکبار پھر اُنہیں پریشانیاں آن گھیریں گی؟

نہیں — اُس نے سوچا۔ وہ بابا سے کچھ نہیں کہے گا۔ مگر —

نائلہ سے بھی ہرگز شادی نہیں کرے گا۔

اِسی عزم کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا۔

وہ رات اُس نے کروٹیں بدل بدل کر گزاری تھی۔

پھر— چند ہی روز بعد— حسبِ معمول وہ شام کو تیار ہو کر ٹینس کھیلنے اپنے کمرے سے نکلا۔ سیڑھیاں اُترنے ہی والا تھا۔ کہ کانوں میں مما کی آواز پڑی۔

''ایک دفعہ شادی ہو جائے نائلہ کی سنگین سے۔ پھر دیکھنا، میں بھی وہی اور۔۔۔'' اُن کا خوشگوار قہقہہ اُبھرا۔ ''نائلہ بھی وہی۔ میں مزید گھر میں بند نہیں رہ سکتی۔ دم گھٹ رہا ہے میرا۔ نائلہ بھی پتہ نہیں کیسے اتنے دن اس گیٹ اَپ میں رہی ہے۔ بچاری لنڈن کی چڑیا۔ ڈال ڈال پر چہکنے والی۔ بالکل بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اچھا ہے اپنی چھوٹی خالہ کے گھر چلی گئی۔۔۔'' مما شاید اپنی کسی دوست سے فون پر بات کر رہی تھیں۔

کچھ دیر دوسری طرف سے بات ہوتی رہی۔

''دونوں ہی دقیانوسی ہیں۔ جیسے باپ ہے ویسا ہی بیٹا ہے۔۔۔'' مما نے جواب میں کہا تھا۔

ایکبار پھر وہ خاموش ہوئیں۔

''کیسے گزارا کرے گی؟'' اُن کا بے باک قہقہہ گونجا۔ ''جیسے میں کر رہی ہوں۔ پیسہ ہے، عیش ہے۔ اُس کے پاس بھی پیسہ ہوگا، عیش کرے گی۔۔۔''

سنگین خان بوجھل سے قدم اٹھاتا سیڑھیاں اُترا۔ باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر کلب چل دیا۔

تو— اُسکی شادی کے بعد مما نے واپس اپنی رنگینیوں میں لوٹ جانا تھا!

اِس کا مطلب تھا وہ نائلہ سے شادی کرتا تو بھی مما نے دوبارہ اپنی پرانی روش اپنا لینی تھی۔

اور— نہ کرتا تو بھی نتیجہ وہی ہونا تھا سو—

عشاء کی نماز کے بعد بابا اپنی لائبریری میں گئے۔ تو وہ بھی وہاں آ گیا۔ پھر— بابا کو بتا ہی دیا کہ کیسے اُس نے چند روز قبل میریٹ میں نائلہ کو نیم عریاں لباس میں کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا اور— آج شام مما کی اپنی دوست سے گفتگو بھی بابا کے گوش گزار کر دی۔

بابا سُن سے رہ گئے۔ کچھ دیر بالکل خاموش رہے۔

''تمہیں اِس لڑکی سے کوئی اٹیچمنٹ تو نہیں ہوئی؟'' بابا گویا ہوئے۔ اُنہیں اپنے سے زیادہ سنگین خان کی فکر تھی۔

''اوہ نو بابا۔ میں نے جو کچھ کیا۔ صرف آپ کی خوشیاں لوٹانے کی خاطر کیا۔''

''تو بس پھر ٹھیک ہے۔ ختم کرو اس بات کو۔ ابھی۔ اِسی وقت'' وہ عزم سے بولے۔

''بات تو میں نے میریٹ میں اسے دیکھتے ہی ختم کر دی تھی۔ بس آپکو نہیں بتایا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ مما کے دوبارہ چھن جانے کا دکھ ہوگا۔۔۔''

''ایک بات بتائیں بیٹا— ہم نے پریشان ہونا کب کا چھوڑ دیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ ہماری بیوی اور ہمارا خیال رکھنے والی تمہاری ماں تھی۔ صرف تمہاری ماں۔ جو اب ہمارے درمیان نہیں رہی۔'' اُن کی آواز میں دکھ عود کر آیا تھا۔ ''لیکن۔۔۔ تم جیسا بیٹا دے کر اُس نے ہماری ہر کمی پوری کر دی ہے۔ اب بھی اگر ہم پریشان ہوئے۔ تو کفرانِ نعمت ہوگا۔'' پھر— وہ ہمیشہ کی طرح خوشگواری سے مُسکرائے۔ ''تمہارے بابا اب بھی اپنے حال میں مست ہیں، خوش ہیں۔ تم ہماری فکر مت کرو۔ اپنی سوچو۔ اپنے لئے خود لڑکی پسند کرو۔ بس ہمیں صرف مِلوا دو۔ آگے ہم جانیں اور ہمارا کام۔۔۔''

سنگین خان نے گہری سانس لی۔ سوچوں سے اُبھرا۔

ساحل کی ریت بہت واضح نظر آ رہی تھی۔ ہوا تیز تر ہو رہی تھی اور— سمندر کی لہریں دودھیا چاند کی تابع اوپر نیچے ہو رہی تھیں!

وہ اندر بیڈ روم میں آ گیا۔ سلیپنگ گاؤن اُتار کر صوفے کی پشت پر ڈالا۔ اور— نرم و گداز بستر میں گھستے ہوئے فون پر بابا کا نمبر ملا لیا۔

''ہے۔۔۔لو۔'' بابا کی جگہ ماما خوش بخت کی آواز سنائی دی۔

طبیعت خوش ہوگئی۔ وہ تھیں ہی کچھ ایسی۔ بہت محبت کرنے والی، بہت کیئرنگ اور بہت ہی مزاحیہ سی شخصیت!

''السلام علیکم ماما۔'' اُس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''ہے۔۔۔لو۔'' ایک بار پھر آواز آئی۔ ''کون ہے بھیا؟''

ماما اونچا سننے لگی تھیں۔ بابا نے اُن کے لئے سننے کا آلہ خرید لیا تھا۔ مگر شاذ ہی استعمال کرتی تھیں۔

''ماما میں ہوں۔ آپ کا سنگین۔ کانوں میں آلہ کیوں نہیں لگا تیں؟'' اُس نے قدرے زور سے کہا۔

''سنگین بیٹا۔ ماما صدقے۔ ماما واری۔ کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں ماما۔ آپ کی صحت کیسی ہے؟''

''ٹائیگر اب بالکل ٹھیک ہے۔ راہ دیکھتا ہے تمہاری۔'' جواب میں اُنہوں نے اُس کے چہیتے کتے کے روبصحت ہونے سے آگاہ کیا۔

''ماما۔'' وہ زور سے بولا۔

''جی میرا بچہ۔''

''جائیں۔ اور کانوں میں آلہ لگا کر آجائیں۔''

''اچھا بیٹا۔''

وہ ریسیور کان سے لگائے اُن کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ساتھ ہی ہنس بھی رہا تھا۔ ویسے کیا کم شگوفے چھوڑتی تھیں۔ کہ اونچا سننے سے مزید ساتوں رنگ بکھیرنے لگی تھیں۔

''ہاں بیٹا۔ اب بولو۔''

''ہاں۔ اب بتائیں۔ آپ کیسی ہیں؟''

''اے بیٹا۔ ٹھیک ہی ہوں۔ اِس عمر میں کوئی کل سیدھی بیٹھتی ہی کہاں ہے؟''

بات عمر کی نہیں تھی۔ بچپن چھپن کی تھیں۔ مگر جانے کیوں کوئی کل واقعی سیدھی نہیں تھی۔

''میں نے ڈاکٹر بختیار سے کہا تھا۔ کہ آپکا حال احوال لیتا رہے۔۔۔''

''کہاں بھیا۔ اُس نے تو بیٹی کیا پیدا کی ہے کہ غائب ہی رہتا ہے۔''

وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔

''ماما بیٹی تو اُسکی بیوی نے پیدا کی ہوگی۔ وہ کیوں غائب رہتا ہے؟''

وہ حسبِ عادت ماما کو چڑانے لگا۔

''یہی تو میں کہتی ہوں۔ بیٹی اُسکی بیوی نے پیدا کی۔ غائب وہ رہتا ہے۔''

''پرواہ نہیں ہے نا اُسے آپکی۔''

''تم یہاں نہیں ہونا بیٹا۔ ورنہ اُسکی مجال تھی۔۔۔''

''میں کل ہی اُسے فون کرتا ہوں۔ کہ آپکے سارے کل پرزے ٹھیک کر دے۔''

''تھنک یُو بیٹا۔ تھنک یُو۔ یہ بتاؤ میرا بچہ آ کب رہے ہو؟''

''بس ماما جلدی ہی۔ بابا کا کچھ کام ہے ہالینڈ میں۔ وہ کرلوں۔ تو سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔''

''جگ جگ جیو میرا بچہ۔''

''ماما۔ ایک بات پوچھوں؟'' جانے کہاں سے اچانک ہی اُسکی دلنشین آنکھوں میں شرارت اُتر آئی۔

''ایک نہیں سو پوچھو۔''

''نہیں بس ایک۔''

''پوچھو۔''

''یہ آپ۔۔۔ رات گئے بابا کے کمرے میں کیا کر رہی ہیں؟''

وہ — کبھی بھی کوئی بھی بات کر جاتا تھا۔ ماما کے لئے کوئی خاص نیا نہیں تھا۔ پھر بھی — اوسان خطا ہوگئے۔

''اے میں تو دن کو بھی اُن کے کمرے میں نہیں جھانکتی۔ رات کو کیا آؤں۔ یہ تو فون بجتا جارہا تھا۔ بڑے صاحب باہر لان میں دوست کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ کریم بھیا کیچن میں اللہ جانے نصیرہ کے ساتھ کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ میں اِدھر سے گزر رہی تھی۔ فون اٹھا لیا۔۔۔''

''نصیرہ کیچن میں کیا کر رہی ہے؟ سرفراز نہیں ہے کیا؟'' اُس نے نصیرہ کے بھائی اپنے کے بارے میں پوچھا۔

''اسکو بخار ہے دو دِن سے۔ اُسکی جگہ نصیرہ آرہی ہے۔''

''اور— آپ کے کریم بھیا نصیرہ کے ساتھ کھسر پھسر کر رہے ہیں۔''

''یہی سمجھ لو بھیا۔ گھنٹے بھر سے چائے کی پیالی منہ سے لگائے کچن میں بیٹھے ہیں۔۔۔''

''کھسر پھسر خطرناک قسم کی تو نہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ۔۔۔کریم بابا کی نیت میں کوئی گڑ بڑ تو نہیں؟''

کریم بابا کی عمر پینسٹھ سال کے قریب تھی۔ نصیرہ پینتیس چھتیس مگر ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔

''اے کیسی بات کرتے ہو بیٹا۔ وہ تو اُسکی بیٹی کی عمر کی ہے۔'' وہ جیسے گھبرا کر بولیں۔

سنگین خان نے اپنی ہنسی بمشکل ضبط کی۔

''آپ ہی تو کہہ رہی ہیں۔ کہ وہ نصیرہ کے ساتھ کھسر پھسر کر رہے ہیں۔''

''اے بیٹا زبان پھسل گئی۔ کہیں کریم بھیا سے نہ کہہ دینا۔''

چھیڑتا تو وہ سبھی کو تھا۔ کہیں اُس سے ہی کہہ دیتا تو؟

''نہیں ماما۔ آپ مجھے اتنا غیر ذمہ دار سمجھتی ہیں۔ اب کریم بابا کا دل آ ہی گیا ہے۔ تو ٹھیک ہے کھسر پھسر کرتے رہیں۔ کوئی خاص حرج بھی نہیں ہے۔ چھڑے ہیں ویسے بھی۔'' کریم بابا کی بیوی دو ہی سال قبل اُنہیں داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔

''اے میرا بچہ۔ چپ کر جا۔ کہیں بڑے صاحب نے سن لیا تو۔۔۔'' وہ واقعی سہم گئی تھیں۔

''ویسے ماما— میں نے پہلے بھی آپ سے ریکویسٹ کی تھی۔ کہ کریم بابا کو بھیا کہنا چھوڑ دیں۔ گھر بسالیں اُن کے ساتھ۔ وہ بھی اکیلے ہیں۔ آپ بھی اکیلی ہیں۔۔۔''

''اے بیٹا۔ تم آج میری شامت لا کر رہو گے۔۔۔'' اُن کی آواز روہانسی ہو گئی۔

سنگین خان گھبرا گیا۔

''ایم سوری ماما۔ ایم سو سوری۔''

''بس ایسا مت کہو۔ میرا دل پھر اور بھی دکھتا ہے۔''

''اچھا بس۔ میری اچھی ماما۔ پھر تنگ نہیں کروں گا۔ اب دوستی کر لیں پلیز!''

''کیا؟ دوست تنگ کرتا ہے؟''

اب — پھر آلہ اُن کے کانوں میں نہیں رہا تھا۔ نکال دیا تھا یا بقولِ اُن کے خود نکل گیا تھا۔

''ماما میں پھر تنگ نہیں کروں گا۔'' وہ قدرے اونچی آواز میں بولا۔ ''اور— بابا کے کون سے دوست آئے ہوئے ہیں؟''

''ہارون صاحب آئے ہیں''؟

''کس وقت آئے ہیں؟''

''رات کا کھانا اِدھر ہی کھایا ہے۔ کافی دیر کے آئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا ماما۔ میں اب بند کرتا ہوں۔ بابا جلدی فارغ ہو گئے تو بتا دیں کہ مجھے رِنگ کر دیں۔ ورنہ کل میں خود کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا بتا دوں گی۔''

''اپنا خیال رکھیں۔ اور— اردگرد پر بھی نظر رکھیں۔ یہ نہ ہو کہ میرے آتے آتے کریم بابا اور نصیرہ۔۔۔'' عادت تھی چھیڑنے کی۔ کیسے باز رہ سکتا تھا؟

''میری جان میرا بچہ۔ مجھے پتہ ہے تم مجھے تنگ کر رہے ہو۔ لیکن ایک بات غور سے سنو۔ کریم بھیا کو پتہ نہ چلے کہ میں کچھ کہا تھا اُس کے بارے میں۔۔۔''

''نہیں نہیں۔ تسلی رکھیں۔ اور— کرنے دیں اُسے کھسر پھسر۔'' آخر میں اُس نے ایکبار پھر کہا۔

ماما بھی ہنس دیں۔ اُسکی چھیڑ چھاڑ کی عادی تھیں۔

''شب بخیر ماما''۔

''شب بخیر بیٹا''۔

اُس نے لیمپ آف کر دیا۔ آنکھیں موند لیں۔

بابا پتہ نہیں کب ہارون انکل سے فارغ ہوتے؟ اور پھر اِس خیال سے کہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔ شاید فون ہی نہ کرتے آج۔

لمحے گزرتے رہے۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا خُمار اُترنے لگا۔ اور—

اُسی ثانیے— بابا کا فون آ گیا۔

''جانِ بابا سو تو نہیں رہے تھے؟''

''نہیں بابا۔ بالکل بھی نہیں۔'' اُس نے اپنی آواز میں نیند کا خُمار صاف چھپالیا۔ کہ بابا پھر خود کو مشکل سے معاف کرتے۔

''تم نے فون کیا تھا۔ مگر میں ہارون کے ساتھ باہر بیٹھا تھا۔ ابھی ابھی گیا ہے وہ۔۔۔''

''بابا آپکے لئے ایک اچھی خبر ہے۔'' وہ بلا تمہید بولا۔

''بتاؤ جانِ بابا۔'' خوشی کے ساتھ ساتھ اُن کی آواز میں تجسس بھی تھا۔

''بابا۔ مجھے۔۔۔ ایک پاکستانی لڑکی پسند آ گئی ہے۔۔۔''

''واہ! دل خوش کر دیا۔ اور یہ تم جھجک کیوں رہے ہو یہ بات کرتے ہوئے۔ شیر کی طرح بولو زور سے۔''

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

''لیکن بابا۔ ایک بات ہے۔۔۔''

''کیا بات ہے؟''

''وہ لڑکی کچھ hesitant ہے۔ آگے بڑھنے سے کتراتی ہے جیسے۔۔۔''

بابا خوشگواری سے ہنس دیئے۔

''لڑکی ہے نا بیٹا۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟ لڑکی نہیں ہے؟'' بابا حسبِ عادت اُسے چھیڑنے لگے۔

وہ بھی ہنس دیا۔ خوشگواری سے

''بابا— پتہ نہیں کیا بات ہے۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے مگر— اِس سے آگے وہ بڑھ نہیں پاتی۔۔۔''

''تو بیٹا اتنی جلدی آگے کیوں بڑھاتے ہو بچاری کو۔'' بابا کے لب و لہجے میں بے تکلف دوست کی سی شوخی تھی۔

وہ ایکبار پھر مسکرایا۔ بابا بات کو سیریس لے ہی نہیں رہے تھے!

''سنو۔'' اب کے بابا سنجیدگی سے بولے۔ ''اُسے پاس بٹھاؤ۔ سمجھاؤ۔ اپنی پسند کا یقین دلاؤ۔ پھر ہمیں بتاؤ کہ وہ کیا کہتی ہے۔''

''جی بابا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایسا ہی کروں گا۔''

بابا صحیح تو کہہ رہے تھے۔ وہ اُسے کہیں پاس بٹھاتا۔ بات کرتا تو بات بنتی نا!

یوں سرِ راہ ملنے پر اور پھر گھر ڈراپ کرنے پر— وہ کتنی بات کر سکتا تھا؟

''یہ بتاؤ۔ جانِ بابا کی پسند خوبصورت تو ہے نا؟'' خوبصورت بہو اُن کی کمزوری تھی۔

''ہاں بابا۔ بہت خوبصورت ہے۔''

''اور عادتوں کی؟''

''لگتی تو اچھی ہے۔''

''کِس گھرانے سے ہے؟''

''سید ہیں۔ مجھے زیادہ پتہ نہیں ہے۔ اور۔۔۔ مڈل کلاس سے لگتی ہے۔''

اُس نے سب بتا دیا۔ اُسے معلوم تھا بابا نے کبھی کلاسز کو اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر وہ بابا کو ہر بات سے باخبر ضرور رکھنا چاہتا تھا!

''بیٹا اچھی طرح— بہت سارے دن پرکھو۔ مڈل کلاس کی لڑکیاں عموماً اچھی بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ مگر— تمہاری مما کے تلخ تجربے نے ہمیں ڈرا دیا ہے۔ ہم ہرگز نہیں چاہیں گے کہ خدانخواستہ تم بھی ہم جیسی محرومی کی زندگی گزارو۔'' بابا کے لہجے میں آج پھر افسردگی عود کر آئی تھی۔

وہ بھی اُداس ہو گیا۔

''بابا آپ دعا کریں۔ کہ میرے لئے یہ لڑکی اتنی اچھی ثابت ہو۔ کہ مجھ سے زیادہ وہ آپ کا خیال رکھے۔ ہمارے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں رہنے لگیں۔''

''آمین۔ لیکن وہ تمہارا بھی اُتنا ہی خیال رکھے۔ جتنا ایک اچھی بیوی کا فرض بنتا ہے۔ تم خوش رہو گے تو ہم خوش ہوں گے نا۔''

''جی بابا۔ اور آپ خوش رہیں گے تو میں خوش ہوں گا نا۔'' اُس نے اُنہی کی بات

دہرائی۔

''جیتے رہو بابا کی جان۔''

پھر— کچھ دیر دونوں اپنی بزنس سے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ہالینڈ میں جو کام اُنہوں نے اُس کے سپرد کیا تھا۔ اُس سے متعلق پوائنٹس ڈسکس کرتے رہے۔ suggestions دیتے بھی رہے۔ اور لیتے بھی رہے۔

پھر— دونوں نے ایکدوسرے کو 'خدا حافظ' کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

زیب نے سنگین خان کا وزٹنگ کارڈ نہیں اٹھایا تھا۔ اُسی طرح سیٹ پر پڑا رہنے دیا تھا۔ مگر—

'جب بھی مجھے بھروسے کے قابل سمجھو۔ فون کر دینا۔۔۔' اُس کی آواز کی بازگشت اُسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

بہت سمجھایا پر— پاگل من کسی طرح سمجھ ہی نہیں رہا تھا!

الٹا اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ سنگین خان اُس امیرزادے کی طرح نہیں تھا۔ جس سے زیبیہ کا واسطہ پڑا تھا۔ الگ تھا اُس سے!

کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ جس سے اُس کو غلط قرار دیا جا سکتا۔ نا ہی کوئی ایسی بات

کی تھی جس سے غلط نتیجہ نکالا جا سکے۔ اُسکی تو نظروں تک میں کبھی ایسا اشارہ نہیں تھا۔ جس سے کوئی غلط مطلب اخذ کیا جا سکتا۔

کہنے کو وہ سب کے درمیان موجود ہوتی۔ مگر ذہن سنگین خان کی طرف ہی لگا رہتا۔ اَپ سیٹ تھی بہت زیادہ۔

'یہ میرا اسیل نمبر ہے۔ جب بھی مجھے بھروسے کے قابل سمجھو۔ فون کر دینا'۔

کبھی وہ سوچتی۔ کہ اُس نے کیوں وہ کارڈ نہیں اٹھایا۔ پھر فوراً ڈر جاتی ایسا سوچتے ہوئے۔ مگر آج —

آج جیسے پچھتا رہی تھی۔ کہ اُس نے کیوں کیا ایسا؟ سنگین خان کو کیسا لگا ہوگا جب کارڈ وہیں پڑا دیکھا ہوگا؟ ضرور بُرا لگا ہوگا۔ پریشان بھی ہوا ہوگا۔ اور —

پریشان وہ اُسے پہلے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج بھی دل بے کل ہوا جا رہا تھا۔

گھر کے پیچھے اوپر بس سٹاپ پر تنہا کھڑی وہ بس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹاؤن سینٹر جانا تھا۔ کئی چھوٹے موٹے کام اکھٹے ہوئے تھے۔ اُس کے بھی اور نازیہ خالہ کے بھی۔

تبھی اُس نے دیکھا۔ دائیں جانب اپنے گھر کی طرف والی موڑ سے سنگین خان نمودار ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے بس سٹاپ کی روڈ پر آ رہا تھا۔

اُس نے نوٹ کیا۔ سنگین خان نے اُس کی طرف دیکھا تھا پھر — نظریں سامنے جما دی تھیں۔ اور — تھوڑی ہی دیر میں اُس کے بالکل پاس سے گزرتا — سیدھا نکل گیا تھا۔

وہ مزید بے چین ہوگئی۔ اُس نے ہمیشہ کی طرح اُسے لفٹ دینے کی آفر نہیں کی تھی۔ یوں پاس سے گزرا تھا۔ جیسے جانتا تک نہیں تھا۔

بے دلی سے وہ شوپنگ کرتی رہی۔ ضروری چیزیں خریدتی رہی۔

پھر — وہ چونکی۔ ایک بڑے سے ڈیپارٹمنٹل سٹور میں جہاں وہ پرس دیکھ رہی تھی۔ اُسی کے ساتھ والے حصے میں وہ شوز دیکھ رہا تھا۔''

ایکبار پھر اُس سے نظریں ملیں۔ مگر اِس قدر اجنبیت تھی اُسکی آنکھوں میں کہ وہ دہل سی گئی۔

تبھی اُسے اندازہ ہوا۔ اُس دن اُسے اَپ سیٹ ہوتا تو وہ پھر دیکھ پائی تھی۔ مگر اِس وقت اُسکی بے رخی برداشت نہیں کر پائی تھی۔

اُسے احساس ہوا۔ وہ اُسے چاہنے لگی تھی!

چاہت اور کیا ہوتی ہے؟ وہ اُسے نظر آتا تھا۔ تو اُس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں۔ اُسکی سنگت سے وہ لطف اندوز ہوتی تھی۔ وہ پریشان ہوتا تھا۔ تو وہ بھی پریشان ہو جاتی تھی۔

پھر — وہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا۔ تو اُسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اُسکی پُر جلال شخصیت، دھیما لب ولہجہ، مخصوص مدھر پرفیوم کی اروما — سبھی تو اسے سحر میں جکڑے رہتے۔

اُس نے بہت — بہت کوشش کی تھی کہ اُس کو اُس کا خیال نہ آئے۔ نہ سوچے اُس کے بارے میں۔ دھیان جھٹک جھٹک دیتی۔ کچھ دیر کو کامیاب ہو بھی جاتی۔ تو پتہ چلتا۔ کبھی 'برائیٹن پیئر' پر، کبھی فروٹ فارمز میں، کبھی بس سٹاپ پر — پھر وہ کھڑا تھا۔ پھر وہ اُسے ہی سوچے جا رہی تھی!

عجیب بے کلی نے آن گھیرا تھا۔ اکثر سوچتی۔ کاش! یہاں آئی ہی نہ ہوتی۔ اُس سے ملی ہی نہ ہوتی!

پاکستان میں اُسے ایسے موقعے ہی فراہم نہ تھے۔ کہ وہ یوں آزادی سے گھومتی پھرتی۔ یا کوئی لڑکا اُسے لفٹ دینے کی آفر کرتا۔

وہ تو بڑا سا دوپٹہ اچھی طرح اوڑھے، قریبی بس سٹاپ پر بس میں بیٹھ کر کالج جاتی تھی اور اِسی طرح واپس گھر آتی تھی اور بس۔

اُسے اپنی صرف ایک دوست کے علاوہ کسی اور کے یہاں آنے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ وہ بھی ابو کے دوست کی بیٹی اور اُسکی کلاس فیلو تھی۔ ابو اُسکی فیملی کو جانتے تھے۔ ورنہ بقول ابو بات بگڑتی ہی دوستوں کے یہاں آنے جانے سے تھی۔ سو —

اُسکی دنیا بہت محدود تھی۔ اور اُسی میں وہ خوش تھی۔ ہاں یہ الگ بات تھی کہ زینیہ کے بچھڑنے کے بعد وہ اور اُسکی خوشیاں ادھوری رہ گئی تھیں۔

زینیہ بھی تو ایک دولتمند لڑکے سے دھوکہ کھا گئی تھی۔ کیا اُس کا بھی انجام اُس جیسا ہونا تھا؟

گھبرا کر اُس نے سر جھٹکا۔قریبی سٹال کی طرف دیکھا۔سنگین خان وہاں نہیں تھا۔کسی اور سٹال پر گیا تھا۔یا پھر واپس جا چکا تھا۔

اُسے پھر سے اُسکا خیال ستانے لگا۔کیا ہو گیا تھا اُسے؟ کیا زینیہ کا انجام اُس کے سامنے نہیں تھا؟

لیکن وہ سنگین خان کو avoid بھی تو نہیں کر پا رہی تھی!

عجیب دوراہا تھا۔ایک طرف زینیہ کی ٹریجیڈی تھی۔دوسری طرف اپنا دل ٹوٹ رہا تھا۔

بارہا اُس نے بھی تو زینیہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔اور ہر بار اُس نے بھی اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔

کیا کسی سے محبت ہو جانا اِسقدر کمزور بنا دیتا ہے انسان کو؟ کیا اتنا مجبور؟

کہ — چاہتے ہوئے بھی اُسے چھوڑا نہیں جا سکتا؟

آج اُسے ماننا پڑا۔اور —

بے اختیار اُسکی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

زینیہ پر بھی اور — خود پر بھی!

سٹور میں یہاں وہاں گھومنے پھرنے کے بعد سامان ٹرالی میں لئے وہ پے منٹ کرنے کیشیئر ڈیسک پر آ گئی۔

وہیں کیو میں — اُس سے آگے — سنگین خان بھی کھڑا تھا۔

اُسے مکمل طور پر ignore کرتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

وہ مزید اُداس ہو گئی۔

اپنی چیزوں کی پے منٹ کی۔اور باہر نکل آئی۔

ہاتھوں میں شوپنگ بیگز لئے آگے بڑھنے لگی۔تو پارکنگ لاٹ سے گاری نکالتے ہوئے وہ دھیمی رفتار سے اُس کے پاس سے گزرنے لگا۔اور —

ایکبار پھر اُسے نظر انداز کر دیا۔

نم آنکھیں لئے وہ بس سٹاپ پر آئی۔بس میں بیٹھی۔تو خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

گھر پہنچتے پہنچتے وہ کافی سنبھل گئی تھی کچن کی چیزیں وہ کچن میں لے آئی۔خالہ وہیں کھڑیں کھانا پکانے کے آخری مراحل میں تھیں۔

''آج میں نے تمہاری پسند کے نوڈلز اور رشین سیلڈ بنائے ہیں۔بس پانچ منٹ ہیں سب تیار ہونے میں۔تم چیزیں رکھ لو۔اور ہاتھ دھو کر جلدی سے آ جاؤ۔میں کھانا لگاتی ہوں۔''

''تھینک یو نازیہ خالہ۔''وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

کچن کی چیزیں اُس نے اپنی اپنی جگہ پر رکھیں۔اور باقی سب کچھ اُٹھا کر آصفہ کے کمرے میں آ گئی۔وہاں بھی اپنی چیزیں الماری میں رکھیں۔اور واش روم میں ہاتھ دھوتے ہوئے کچن میں آ گئی۔نازیہ خالہ وہیں گول ڈائیننگ ٹیبل پر کھانا لگا چکی تھیں۔

دونوں مل کر کھانا کھانے لگیں۔نواز خالو، آصفہ اور کاشف دیر سے آتے تھے۔لنچ وہیں اپنی اپنی جگہوں پر کیا کرتے تھے۔

کھانے کے بعد نازیہ خالہ نماز پڑھنے اور پھر آرام کرنے اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔

زیب بھی کمرے میں آ گئی۔نماز پڑھی۔اور بستر میں لیٹ رہی۔

تھکی تھکی آنکھیں موندیں۔تو نیند کی جگہ سنگین خان در آیا۔

اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔نہیں دیکھنا چاہتی تھی وہ اُسے۔بہت سنگدل تھا وہ۔بہت بے حس۔

اُس کا وزٹنگ کارڈ ہی تو نہیں اٹھایا تھا نا اُس نے۔کیا اتنا بڑا قصور کیا تھا؟

انا مجروح ہوئی تھی اُسکی۔دل نے کہا۔

انسلٹ کا بھی احساس ہوا ہو گا۔اُس نے مانا۔

rejection بھی محسوس ہوئی ہو گی۔اُس نے ایڈمٹ کیا۔

لیکن —

وہ کیا کرتی؟ وزٹنگ کارڈ لے لیتی کہ اُس کے ساتھ ہر وقت کا ساتھ مول لے لیتی؟ بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی۔اور انجام؟ وہ کانپ کر رہ گئی!

کروٹ دیوار کی طرف لیتے ہوئے اُس نے ایکبار پھر آنکھیں بند کر لیں۔کہ شاید سکون

میسر ہو۔ مگر—

پھر وہی — سنگین خان!

وہ تو جیسے آنکھوں میں بس کر رہ گیا تھا اُسکی۔ اور—

اُسکی آنکھوں میں بدلیاں چھا گئیں۔ کہ سنگین خان دھندلا جائے۔ پھر—

برس پڑیں۔ کہ وہ ڈھل جائے!

مگر— پھر بھی ایسا نہیں ہوا۔ بھری برسات میں وہ وہیں ڈٹا رہا!

تب —دونوں آنکھیں بازو سے ڈھکتے ہوئے وہ بے اختیار رو دی۔ بے حساب رو دی!

پھر— روتے روتے ہی اُسکی آنکھ لگ گئی۔

اُس کے دن کرب میں اور راتیں درد میں گزر رہی تھیں۔

اُس دن کے بعد بھی کل شام کو آصفہ کے ساتھ اپنے گھر کے آگے فٹ پاتھ پر واک کرتے ہوئے دور سے اُسے اُس کے گھر جانے والی روڈ پر جاتے دیکھا تھا۔ سنگین خان نے اُسے دیکھا تھا یا نہیں۔ مگر وہ —دور سے بھی اُسکی گاڑی پہچان سکتی تھی۔ اُسکی جھلک جان سکتی تھی۔

رات پھر وہ بے چین رہی تھی۔ بے کل!

وہ ایک ایسی مشکل میں تھی۔ جس میں وہ پڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اور— اُسی مشکل سے دو چار ہونے کو بیقرار بھی تھی!

یہ کیسا درد تھا کہ جس کی چبھن اتنی میٹھی تھی۔ جس کی کسک اتنی لذت آمیز تھی؟

"زیب بیٹا۔" نازیہ کچن سے نکلتے ہوئے آصفہ کے کمرے میں جھانکیں۔

آج ناشتہ کرنے کے بعد وہ دوبارہ بستر میں گھس گئی تھی۔ جانے کیوں؟ کوئی کام کرنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ روزانہ جو بہانے بہانے اِس خوبصورت چھوٹے سے سمندر کنارے آباد شہر کے چکر لگاتی تھی۔ آج وہ بھی باہر نکلنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

"جی خالہ۔" وہ بستر میں بیٹھے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟" وہ پاس چلی آئیں۔ "بستر میں کیوں گھسی بیٹھی ہو؟"

خلاف توقع ہی تو تھا اُس کا اِس وقت بستر میں گھسے رہنا۔

"کچھ نہیں نازیہ خالہ۔ بس ویسے ہی۔۔۔ کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔"

نازیہ نے غور سے دیکھا۔ اُسکا چہرہ کمہلایا سا تھا۔ آنکھیں اُداس سی تھیں۔ وہ یہی سمجھیں۔ کہ ماں باپ یاد آئے ہوں گے۔ یا پھر— زینیہ کا خیال آیا ہو گا۔

"اُٹھو میرا بچہ۔" اُنہوں نے شفقت سے اُسکے بال سہلائے۔ "منہ ہاتھ دھوؤ۔ کپڑے بدلو۔ اور باہر نکلو گھر سے۔ گھوم پھر لو۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔"

"نازیہ خالہ آج دل نہیں کر رہا۔ ورنہ میں تو تقریباً روز ہی باہر نکلتی ہوں۔" اُس کی آواز میں بھی اُداسی عود کر آئی تھی۔

"نہیں۔ اُٹھو شاباش۔" وہ اُسکی اُداسی بھانپ چکی تھیں۔ زبردستی بستر سے باہر نکالا۔

"چلو واش روم۔ فریش ہو۔ اور کپڑے بدل کر باہر جاؤ۔ گھوم پھر آؤ۔۔۔"

وہ ٹال نہ سکی۔ تھوڑی ہی دیر میں واقعی تیار ہو گئی۔

جاتے جاتے وہ خالہ کے پاس کچن میں آ گئی۔

"نازیہ خالو آپکو کچھ چاہیے تو نہیں؟"

"ہاں Peanut Butter لے آؤ۔ اور کٹکٹ چوکلیٹ بھی۔ کچن آتی ہوں تو یاد آ جاتا ہے۔ کچن سے نکلتے ہی بھول جاتی ہوں؟

"ٹھیک ہے نازیہ خالہ۔" اُس نے قدرے توقف کیا۔ "نازیہ خالہ میں آج 'برائیٹن لائبریری' چلی جاؤں؟"

وہ ایک دفعہ پہلے بھی آصفہ اور کاشف کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ یہاں سے خاصے فاصلے پر تھی۔ لیکن —

ایک جہان تھا وہاں کتابوں کی collection کا۔ کس موضوع پر اور کس علم سے متعلق کتاب ہو گی۔ جو وہاں نہیں تھی۔ مذہبی، سیاسی، سائنس، ریاضی، ادب، فکشن، بزنس— بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کے انٹرسٹ کی ہر چیز موجود تھی۔

آصفہ اور کاشف کے ساتھ تو وہ صرف بڑے سے احاطے پر محیط لائبریری کا سرسری چکر ہی لگا کر آ گئی تھی۔ آج دل چاہتا تھا۔ اپنی من پسند کوئی کتاب لیکر کئی اور لوگوں کی طرح ایک طرف بیٹھکر اندر سے بھی دیکھے پڑھے۔ کافی سارا وقت گزارے وہاں۔ کہ واپس پاکستان جائے۔ تو اتنی بڑی اور مشہور ترین لائبریری کی یاد ذہن میں بسا کر لے جائے۔

"ضرور جاؤ۔ بلکہ اچھا ہے کہ جاؤ۔ وقت اچھا گزر جائے گا۔" ساتھ ہی اُنہوں نے اُسے وہاں ڈائریکٹ جانے والی بس کا نمبر بھی بتا دیا۔

اور—

اُن کی اجازت پاتے ہی وہ چل پڑی۔

آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا بھیگی بھیگی سی۔ اور— شبنمی موسم نم نم سا۔

سردی خاصی تھی۔ چوکلیٹ پنک شلوار قمیص پر سفید خوبصورت سویٹر، کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹہ اور لیدر شوز پہنے، ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکائے وہ اوپر بس سٹاپ کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔

مطلوبہ نمبر کی بس آئی۔ تو وہ اُس میں بیٹھ گئی۔

قریباً پینتالیس منٹ بعد وہ لائبریری کے گردونواح میں بس سے اُتر گئی۔

جھکے جھکے بادل بوجھل ہو رہے تھے۔ بھیگی بھیگی ہوا تیز ہو رہی تھی اور— وقت سے پہلے ہی شام اُتر آئی تھی۔

وہ پیدل آگے بڑھنے لگی۔ اچھا خاصا راستہ تھا لائبریری تک مگر اُس نے طے کر ہی لیا۔

اندر داخل ہو گئی۔

تبھی اُسے کسی نے بازو سے پکڑ لیا۔

مڑ کر دیکھا۔ سنگین خان تھا۔ کچھ بھی بولے بنا اُسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ اتنے زور سے اُسے پکڑا تھا۔ کہ اُسکی انگلیاں اُسے چبھنے لگی تھیں۔

"You are hurting me." وہ بول ہی پڑی۔

"Shut up — and come." اُس نے اب بھی اُس کا بازو نہیں چھوڑا۔ نا ہی گرفت ڈھیلی کی۔

وہ اِس قدر غیض وغضب میں تھا۔ کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چپ چاپ ساتھ ہو لی۔

پارکنگ تک لا کر اُس نے اُس کے لئے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اُسے پسینجر سیٹ پر ڈھیر کیا۔ سامنے سے گھومتا ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ اور —

گاڑی سڑک کی طرف لیجانے لگا۔

اُس نے ہیڈ لائیٹس آن کر دی تھیں۔ تیز تیز چلتے وائیپرز میں سے جھانکتا وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ راستہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔

وہ چپ چاپ سہمی سہمی سی بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ بھی خاموش تھا۔ نظریں سڑک پر جمائے جھنجلایا جھنجلایا سا ڈرائیو کر رہا تھا۔

چند موڑ مڑنے کے بعد وہ ایک کھلی سڑک پر آ گیا۔

پھر — آگے بڑھنے لگا۔

زیب چونکی۔ یہ راستہ اُن دونوں میں سے کسی کے گھر کو نہیں جاتا تھا۔

''آپ ۔۔۔ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ جھجکتے جھجکتے بولی۔

''چُپ۔''

وہ سہم کر رہ گئی۔ اُس کا یہ روپ اُس کے لئے نیا تھا!

وہ آگے ہی آگے چلتا گیا۔

''آپ ۔۔۔ مجھے میرے گھر لے جائیں۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

زیادہ غصے میں اُسے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا۔ کہ وہ سرتاپا بھیگ چکی تھی۔

اُس نے چپ چاپ ہیٹر آن کر دیا۔ اب بھی غصہ غصہ تھا۔

تھوڑی دیر وہ خاموش رہی۔ مگر وہ اُسے کہاں لے جا رہا تھا؟ یہ تو وہ جاننا چاہتی تھی نا!

''ہم ۔۔۔ کہاں جا رہے ہیں؟'' اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

''تمہارے گھر ہی جا رہا ہوں۔'' وہ اب بھی برہم تھا۔

''میرے گھر کو تو یہ راستہ نہیں جاتا۔''

''چلا جائے گا۔'' وہ پھر غصے سے بولا۔

''تو آپ ۔۔۔ غصے کیوں ہو رہے ہیں؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''چپ کر کے بیٹھی رہو۔'' وہ درشتگی سے بولا۔

اور — اپنی نم آنکھیں چھپانے کو اُس نے سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

سنگین خان نے چونکتے ہوئے اُسکی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ اور ایسا اُس نے ہرگز نہیں چاہا تھا۔ وہ دھیما پڑ گیا۔

''زیب۔'' وہ قدرے نرمی سے بولا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر اُٹھاتے ہوئے رخ اپنی کھڑکی کی طرف کر لیا۔ بہتے آنسو اُس کے گال بھگو رہے تھے۔

''پلیز! میرا مطلب تمہیں hurt کرنے کا نہیں تھا۔۔۔''

وہ چپ رہی۔ باہر ہی تکتی رہی۔ بار بار گالوں پر لڑھک کر آتے آنسو انگلیوں کی پوروں سے پونچھتی رہی۔

"I'm sorry." وہ متاسف لگ رہا تھا۔

اُس نے رخ اندر کی طرف کر لیا۔ آنسو پونچھ لئے۔

"It's Okay." سرخ سرخ متورم آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

اُسکی Intoxicating آنکھوں نے اپنا سارا خمار اُسے منتقل کر دیا۔ مخمور سا ہوتے ہوئے اُس نے بے بس سی سانس لی۔

کیا اِس لڑکی کو معلوم تھا۔ کہ وہ مکمل طور پر اُس کے سحر میں جکڑ چکا تھا؟

بارش کا زور کم ہو رہا تھا۔ وائپر ز اب بھی چل رہے تھے۔ وہ اب بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

زیب نے دیکھا۔ اب راستہ جانا پہچانا سا تھا۔ آج شاید وہ کسی دوسرے راستے سے آیا تھا۔ ایک ہی جگہ کو کئی راستے آسکتے ہیں۔ اُس نے مانا۔ لیکن —— اُس کا بھی قصور نہیں تھا۔ نئی نئی تھی یہاں!

''راستہ تمہارے گھر کو ہی جا رہا ہے نا؟''

جانے کیوں زیب کو لگا وہ اُس پر طنز کر رہا تھا۔ اُس پر ٹرسٹ نہ کرنے پر!

''جی۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''پہلے کیوں ڈر گئی تھیں؟'' لہجہ اب بھی چبھتا سا تھا۔

''بس ویسے ہی۔''

چند ثانیے دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

''آپ۔۔۔ مجھ پر غصہ کیوں تھے؟'' وہ بھی جاننا چاہتی تھی۔

''تمہارے پاگل پن پر۔ اتنے زور کی بارش تھی۔ اور تم پیدل نکل گئی تھیں۔۔۔''

''تو اور کیا کرتی؟''

''بیٹھی رہتیں وہیں۔ جب تک بارش رُک نہیں جاتی تھی۔۔۔''

''اور تب تک آپ کی بیزاری سہتی رہتی''۔ بے ساختہ اُسکی زبان پر آ گیا۔

وہ مسکرادیا۔ تلخی سے۔

''تو —— بیزاری سمجھتی ہو۔'' وہ اب بھی نظریں سڑک پر جمائے تھا۔

کیا یہ بیزاری اُسکا وزٹنگ کارڈ ریجیکٹ کرنے سے زیادہ تکلیف دہ تھی؟

''آپ بے حس بھی ہیں۔'' اُس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''بے حسی بھی جانتی ہو۔'' اُس نے اُسی لہجے میں کہا۔

کہ اُس دن اُس کا کارڈ نہ اٹھا کر اُس نے کیا کم بے حسی دکھائی تھی؟

وہ سمجھ گئی۔ وہ اُس پر اُس کا وزٹنگ کارڈ نہ اٹھانے پر چوٹ کر رہا تھا۔ مگر وہ بھی ایسا کرنے پر کچھ کم بے کل نہیں رہی تھی۔ جس کرب سے وہ گزر رہی تھی۔ جس درد سے وہ دوچار تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور ——

زیب کی یہ مجبوری تھی۔ کہ اُسے کچھ بتا بھی نہیں سکتی تھی!

بارش اب رک گئی تھی۔ موسم البتہ بھیگا بھیگا تھا۔

زیب کے گھر کا بس سٹاپ قریب آ رہا تھا۔ بس سٹاپ کے ساتھ ہی ڈھلان پر پگڈنڈی نیچے اُن کے گھروں کے فٹ پاتھ، تک جاتی تھی۔ وہ یہاں سے بآسانی اور جلدی بھی گھر پہنچ سکتی تھی۔

''مجھے یہیں بس سٹاپ کے پاس اتار دیں۔ آگے میں خود چلی جاؤں گی۔'' اُس نے کہا۔

اور —— سنگین خان پر ایکبار پھر زیب کا اُس پر بھروسہ نہ کرنے کا جنون چڑھ دوڑا۔

کچھ بھی بولے بغیر ''زوں'' کر کے تیزی سے بس سٹاپ کے آگے سے گزر گیا۔

پھر —— اُسی تیزی سے دایاں موڑ کاٹا۔ چلتا گیا۔ اور ——

اپنی سٹریٹ میں مُڑتے ہوئے فُل سپیڈ سے آگے بڑھتا —— اپنا گھر پیچھے چھوڑتا ایکبار پھر دائیں مڑا۔ اور ——

اُس کی سٹریٹ میں جا کر گاڑی روکتے ہوئے دم لیا۔

سنگین خان تیزی سے گاڑی سے اترا۔ سامنے سے گھوم کر آتے ہوئے اُس کا دروازہ کھولا۔ وہ اُترنے لگی۔

''گھر جا کر خود کو اچھی طرح چیک کر لو۔ کہیں میں نے تمہیں کم تو نہیں کر لیا کہیں سے؟'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''خدا حافظ''۔ وہ بولی۔ اور ——

خالی خالی سا ذہن لئے اپنے گھر کی طرف ہو لی۔

متوالی شام گہری ہو رہی تھی۔شبنمی ہوائیں چھیڑ خانیاں کر رہی تھیں۔ دور پار کے جزیروں سے آتی خوشبوئیں مستی لٹا رہی تھیں۔اور چاروں —اُور سرور چھا رہا تھا۔

اپنی بالکنی میں دم سادھے کھڑا وہ فطرت کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔

گہرے پانیوں میں بتیاں روشن کئے ایک بارج سامنے سے گزرنے لگی۔تو اُسکی محویت ٹوٹی۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے میز پر دونوں ٹانگیں سیدھی پھیلا دیں۔نظریں بارج کا پیچھا کرنے لگیں۔اور—

ذہن زیب کی طرف پلٹا۔

اُس نے بہت زیادتی کی تھی آج اُس کے ساتھ۔

اُس نے اگر کہا تھا۔کہ وہ اُسے بس سٹاپ کے پاس اتار دے۔آگے وہ خود چلی جائے گی۔تو — کچھ بُرا بھی نہیں کہا تھا۔پگڈنڈی پر نیچے اُترتے ہی چند قدم پر اُس کا گھر تھا۔ضروری نہیں کہ وہ اُس پر بھروسہ نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ ایسا تھا ہی نہیں۔وہیں سے گھر نزدیک تھا۔اور اُس نے کہہ دیا۔بس اتنی سی بات تھی۔لیکن—

اُس سے پہلے جو اُس نے کہا تھا—

'آپ---کہاں جا رہے ہیں؟'

'ہم---کہاں جار'ہے ہیں؟'

'میرے گھر کو تو یہ راستہ نہیں جاتا۔'

اِس پر وہ پہلے سے ہی برہم تھا۔اوپر سے اُس نے بس سٹاپ پر اتارنے کو کہا۔تو اُس کا پارہ مزید اوپر چڑھ گیا تھا۔گاڑی اتنی تیز چلائی تھی۔کہ وہ سہم کر رہ گئی تھی۔وہ اُترنے لگی تھی۔تو اور بھی درشتگی سے بات کی تھی۔

اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔اتنی سختی نہیں برتنی چاہیے تھی۔اِس وقت وہ واقعی پچھتا رہا تھا۔اُس کے پاس اُسکا کوئی کونٹیکٹ نمبر ہوتا۔تو وہ ضرور اُس سے اپنے رویے کی معافی مانگتا۔اور—

ایکبار پھر—اُسے غصہ آ گیا۔اُس نے بھی تو اُسے تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔فون نمبر مانگا تھا۔تو دینے سے انکار کر دیا تھا۔اپنا نمبر دینے لگا تھا۔تو سیٹ پر ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اُس پر پھر وحشت طاری ہونے لگی۔بالکنی سے بیڈروم میں آیا۔جیکٹ پہنی۔اور—

نیچے آتے ہوئے گیرج سے گاڑی نکالی۔اور—

گھر سے باہر نکلتے ہوئے مختلف سڑکوں پر بے مقصد گھومنے لگا۔

رات گھر آئی تھی۔تاروں کی بارات جھلمل جھلمل کر رہی تھی، پہاڑیوں پر بنے گھروں میں روشنیاں دمک رہی تھیں۔اور— ہریالیوں کی مدبھری خوشبوئیں جادو جگا رہی تھیں۔

اُس نے 'برائیٹن مرینہ' میں 'The Pagoda Restaurant' کی پارکنگ میں

گاڑی پارک کر لی۔ اور—
ڈنر کے لئے بڑی سی ہلکورے لیتی بوٹ کے اندر آکر ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔
اس وقت وہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ ویٹر پاس آیا۔ تو اُس نے کھانا آرڈر کیا۔ اور—
ریلیکس ہو کر بیٹھتا سرسری نظروں سے اِردگرد دیکھنے لگا۔
تبھی— اُس نے دیکھا۔ زیب اور اُس کا کزن بھی ایک ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

اور—
اُس نے سوچ لیا۔ آج وہ اُس سے فون نمبر لے کر رہے گا!
غصہ آئے گا تو غصہ اتارے گا۔ اور— اپنی کسی زیادتی کا احساس ہوگا۔ تو 'سوری' کہے گا۔ یوں بغیر کسی کونٹیکٹ کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا مزید کڑھتا نہیں رہے گا!
اُس کا کھانا آگیا۔ تو وہ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ہاں زیب کی ٹیبل کی طرف گاہے گاہے ضرور دیکھتا رہا۔
اچانک قسمت یاور ہوئی۔ اور کاشف انے کس کام سے وہاں سے اُٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔
''سیل نمبر دو اپنا''۔ اُس کے سر پر پہنچتے ہوئے وہ بلاتمہید بولا۔
چند پل وہ حیران اور پھر تذبذب میں پڑ گئی۔
"Quick—before your cousin comes." وہ مزید بولا۔
کاشف کے آجانے کا تو اُس سے ابھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکنک اُس کا طمطراق اور لہجے کا تحکم ہی کچھ ایسا تھا۔ کہ کچھ بھی سوچے بنا بلا چوں وچرا اُس نے اُسے اپنا سیل نمبر دے دیا۔
لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ واپس اپنی میز آگیا۔ کھانا وہ تقریباً کھا چکا تھا۔ پیپسی کا گلاس لیکر آخری چند گھونٹ پینے لگا۔ اُس کا ٹینشن کافی حد تک کم ہوگیا تھا۔ اب وہ ماحول کو انجوائے کر رہا تھا۔

سوچوں میں گم زیب اب کھانے سے زیادہ پلیٹ میں کانٹے سے کھیل رہی تھی۔
کاشف واپس آچکا تھا۔ اُسکے ساتھ گپ شپ کرتا کھانا کھا رہا تھا۔ پھر—

اُس نے محسوس کیا۔ وہ کچھ چپ چپ سی لگنے لگی تھی۔
''باجی۔ آپ چپ چپ کیوں ہیں؟ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھا رہیں۔''
''نن۔ نہیں تو۔'' اُس نے کھانا شروع کیا۔
اِس کے باوجود وہ سوچوں میں گم تھی۔
کیوں اُس نے اُسے فون نمبر دیا؟ وہ تو خفا تھی اُس سے۔ کتنا غصہ ہوا تھا اُس پر صبح؟
کیا وہ اُسے فون کرے گا؟ دل جانے کیوں بے اختیار دھڑکا۔
کیا سلسلہ شروع ہو جائے گا؟ سلسلہ— جسے وہ اب تک avoid کرتی آرہی تھی!
سوچوں میں ہی کھوئی اُس نے جھکا سر اٹھایا۔
سامنے ہی کچھ فاصلے پر بیٹھا سنگین خان اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کسی بھی جذبے سے عاری، خالی خالی نظروں سے۔
اُس نے پھر سے نظریں اپنی پلیٹ پر جما دیں۔
وہ کیوں سپاٹ چہرہ لئے تھا؟ غصے بھی اُس نے کئے تھے۔ اور سیریس بھی وہ ہو رہا تھا!
پر— اُس سے نمبر لینے تو بڑے زور شور سے آیا تھا۔ کیا یہ بھی اُس کی شان کا کوئی حصّہ تھا؟
اور— وہ کیوں اُسکے طمطراق اور تحکمانہ لب و لہجے سے مرعوب ہوگئی تھی؟
وہ پچھتانے لگی۔ نہیں دینا چاہیے تھا اُسے نمبر!
''چلیں باجی؟'' کاشف اُسے کھانا ختم کرتے دیکھکر بولا۔
اور— اُسکی سوچیں بکھر گئیں۔
''ہاں۔ چلو۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
غیر ارادی طور پر ایکبار پھر سنگین خان پر نظر پڑی۔
وہ بھی اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اب کے دلنشیں آنکھیں یکسر بدلی بدلی تھیں۔ خفا خفا سی، ناراض ناراض سی!
اور— زیب نے گہری سانس لی۔
کیا اِس آدمی کو معلوم تھا۔ کہ اُسکی خفگی، اُس کی ناراضگی زیب کی کمزوری تھی؟

رات اُس نے پھر کروٹیں بدلتے گزار دی۔ کبھی نظروں کے سامنے اُس کا سپاٹ چہرہ آ جاتا۔ تو کبھی خفا خفا اور ناراض ناراض سی آنکھیں۔

چہرہ اِس لئے سپاٹ تھا۔ کہ وہ اُس پر غصہ تھا کیونکہ اُس نے اُسکا وزٹنگ کارڈ قبول نہیں کیا تھا۔ نظریں اِس لئے خفا اور ناراض تھیں۔ کہ وہ اُسے پسند بھی کرتا تھا۔

ہاں— وہ اتنی کم عقل بھی نہیں تھی۔ کہ اُسکی پسند نہ جان سکتی!

اور—

اُسے یہ بھی یقین تھا۔ کہ اُس سے زیادہ خود وہ اُسے پسند کرتی تھی!

رات بے چین تھی۔ بے کل تھی۔

وہ بھی بہت بے چین تھی۔ بہت بے کل تھی۔

جانے کس پہر نیند نے غلبہ پایا۔ اور وہ سوگئی۔

کتنے ہی دن بیت گئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مجسم انتظار تھی۔ کہ سنگین خان اُسے فون کرے گا۔ پورا یقین تھا اُسے ایسا ہونے کا۔ مگر—

سنگین خان نے اُسے فون کرنا تھا نہ کیا۔

اور— بجائے اس کے کہ فون کے اُس سلسلے کے شروع ہو جانے سے جس سے وہ خوفزدہ تھی، وہ اطمینان کا سانس لیتی۔ اُس کا چین وقرار ہی لُٹ گیا۔

ہر رنگ اور ہر میسج پر اُسکی نظریں بے تابی سے سیل پر جاتیں۔ لیکن— وہ سنگین خان کا نہیں ہوتا تھا!

گھر سے باہر فیملی کے ساتھ واک کرتے ہوئے اُسکی نظریں سنگین خان کے سمندر سائیڈ

والی روڈ پر ہوتیں ۔مگر اُسے وہ یا اُسکی گاڑی نظر نہیں آئی ۔

ٹاؤن سینٹر جانے کے لئے بس سٹاپ سے لیکر شہر تک کا تمام راستہ اُسکی نظریں غیر ارادی طور پر اُسے ہی تلاش کرتی رہتیں ۔لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

بازار میں شوپنگ کرتے ہوئے بھی اُسکی آنکھیں اُسے ہی کھوجتی رہتیں ۔ پر — مایوس لوٹ آتیں!

آج وہ 'The Lanes' گئی تھی ۔ بہت ساری چھوٹی چھوٹی twisting سٹریٹس کا سلسلہ، یہاں ہمیشہ بہت رش ہوتا تھا۔ دنیا کی ہر چیز با افراط مل جاتی تھی ۔ مشہور برینڈ نیمز کا قیمتی ساسمان یہاں بھی کثرت سے مل جاتا ہے۔

فرانس کے نزدیک ہونے کا اثر تھا۔ کہ یہاں جگہ جگہ Pavement Cafes پائی جاتی تھیں ۔

وہ کافی دیر تک گھومتی پھرتی رہی ۔اینٹیکس، جیولری، کپڑے، شوز، hates — کیا نہیں تھا؟ لدی پھندی دکانیں اور روشنیوں کی چکا چوند ۔آنکھیں چندھیا چندھیا گئیں ۔

تھک تھکا کر وہ ایک Pavement Cafe میں آ گئی ۔

کوفی اور سینڈوچ آرڈر کئے ۔اور باہر فٹ پاتھ پر لگی ٹیبلز میں سے ایک پر آ بیٹھی ۔

لوگوں کی آتی جاتی ہجوم پر نظریں جمائے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے کوفی پی رہی تھی ۔

"May I join you Ma'am?" لمبا قد ۔ بلواش وائیٹ سوٹ اور ڈارک بلو شرٹ میں ملبوس جیتا جاگتا اپالو اُسکے سامنے کھڑا اُس سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

وہ اِس اچانک ملاقات کے لئے تیار نہیں تھی ۔ چپ چاپ اُسے تک رہی تھی ۔

وہ مسکرا دیا ۔ دلآویزی سے ۔

پھر — خود ہی اُسکی مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا ۔

ویٹر پاس آیا ۔ تو اُس نے اپنے لئے کوفی آرڈر کی ۔

زیب اب بھی چپ تھی ۔ ہاتھ میں پکڑا کوفی کا کپ آہستہ سے میز پر رکھ دیا ۔

''ٹھنڈی ہو جائے گی ۔ پی لو ۔'' وہ اپنائیت سے بولا ۔

بہت دن بعد اُس نے بہت نرمی سے بات کی تھی ۔ کان جیسے نا آشنا سے ہو گئے تھے اُسکی نرمی کے ۔جانے کیوں آنکھیں خواہ مخواہ نم ہو گئیں ۔۔۔

سنگین خان گڑبڑا گیا ۔ اُس نے واقعی اُسے بہت تکلیف دی تھی ۔ وہ بہت نازک تھی ۔ اُسکی اتنی بے حسی برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔

"Look at me." اُس نے زیب سے ملائمت سے کہا ۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُسکی نظریں اوپر اٹھ گئیں ۔

"Smile."

"No."

"Please!"

''نہیں ۔''

''اچھا ۔'' اُس نے اپنے دونوں کان پکڑ لئے ۔ ''اب؟''

اور — وہ بے ساختہ ہنس دی ۔

دھوپ چھاؤں کا یہ حسین امتزاج اُسے بے خود کر گیا ۔

غور سے اُسکی آنکھوں میں تکتا رہا ۔ کئی پل بیت گئے ۔

''آئندہ نہیں رونا، ہوں ۔''

''آئندہ غصہ بھی نہیں کرنا ۔''

وہ ہنس دیا ۔ خوبصورتی سے ۔

''ٹھیک ہے ۔''

"Promise?"

"Promise."

اور یوں —

دونوں کی صلح ہو گئی ۔

سنگین خان کی کوفی آ گئی تھی ۔ گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا وہ اُسے ہی تکتا جا رہا تھا ۔

''ایسا کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔''

اِس کے باوجود اُسکی نظریں اُسی کے چہرے کا طواف کئے جا رہی تھیں۔

وہ نظریں چُرا رہی تھی۔ بار بار اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔'' وہ کوونی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں؟'' وہ قدرے حیرت سے بولی۔

''پھر وہی؟'' وہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔

وہ چپ سی ہوگئی۔ وہیں بیٹھی رہی۔

سنگین خان کو فوراً اپنے لہجے کا احساس ہوا۔

''آؤ۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''ابھی ابھی آپ نے پرومس کیا تھا۔ کہ غصے نہیں کریں گے۔'' وہ سر جھکائے روٹھی روٹھی سی بولی۔

''اچھا سوری۔'' اُس نے اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اُٹھایا۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ کہ وہ اُسے کہاں اور کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اب تک اُس کے فوراً برہم ہونے کا اُسے خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ دہرانا مشکل لگا۔ پھر—

کافی دنوں کے اَن بَن کے بعد دونوں میں صلح ہوئی تھی۔ اُس کا بھی دل چاہتا تھا۔ کہ وہ اُس کے ساتھ باتیں کرے۔ وہ زیادہ تر آنکھوں سے باتیں کرتا تھا۔ اُسکی نشیلی آنکھیں ہر زبان جانتی تھیں!

دونوں گاڑی میں بیٹھے اور—

سنگین خان شہر سے باہر جاتی ایک سڑک پر ہولیا۔

کولتار کی پتلی سی وائینڈنگ روڈ تقریباً سنسان تھی۔ وہ درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

''ہوں۔ پوچھو۔''

''آپ۔۔۔ غصے تو نہیں ہوں گے؟'' اُس نے اپنا اندیشہ ظاہر کر ہی دیا۔

''نہیں۔'' وہ خوبصورتی سے مسکرا دیا۔

''ہم۔۔۔ کہاں۔۔۔ جا رہے ہیں؟''

اب کے وہ کُھل کر ہنس دیا۔ اُس نے اُسے خاصا ڈرا دیا ہوا تھا۔

''بس—یوں ہی چلتے رہیں گے۔ کہیں مناسب سی جگہ دکھائی دی۔ تو بیٹھ جائیں گے۔ در اصل۔۔۔ یہ مسئلہ بھی تو حل کرنا ہے۔۔۔''

''مسئلہ؟''

''ہاں۔''

''کون سا مسئلہ؟'' وہ قدرے حیرت سے بولی۔

''یہی—تمہارا—مسئلہ۔۔۔''

''میرا کیا مسئلہ ہے؟'' وہ واقعی نہیں سمجھی۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ نظریں اب بھی سڑک پر جمی تھیں۔

دراصل— آج وہ بابا کی بات پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ کہ—

'اُسے پاس بٹھاؤ۔ سمجھاؤ۔ اپنی پسند کا یقین دلاؤ۔۔۔'

جب اُس نے فون پر بابا کو زیب کے بارے میں بتایا تھا۔ کہ وہ اُسے پسند تو کرتی ہے۔ مگر آگے بڑھنے سے کتراتی ہے۔ تو بابا نے یہی کہا تھا۔ کہ وہ اُسے اپنے دل کا حال بتائے گا۔ تو وہ آگے بڑھے گی نا!

یہ تو بیچ میں اُسکی دانست میں زیب کا اُس پر ٹرسٹ نہ کرنے کی وجہ سے اُن دونوں کی کئی دن آپسمیں اَن بَن رہی۔ ورنہ وہ کبھی کا بابا کی بات پر عمل کر چکا ہوتا۔

اُس کے پاس زیب کا فون نمبر بھی آ چکا تھا۔ مگر—

اُس کے وزِٹنگ کارڈ پر درج اُس کا سیل نمبر سیٹ پر ہی چھوڑ کر اُس کا یوں چلے جانا اُسے

اِس قدر humiliating لگا تھا۔ کہ اُس نے زیب کا نمبر صرف نوٹ کر لیا تھا اور بس!

وہ بھی صرف اِس لئے کہ —

آخری بار جب اُس پر غصہ ہوا تھا۔ اور بعد میں اپنی زیادتی کا احساس ہوا تھا۔ تو اُس سے معافی مانگنے کے لئے اُس کے نمبر کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اور نمبر نہیں تھا۔ تو وہ پھر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

سوچوں میں گم ایک مبہم سی مسکراہٹ ایکبار پھر اُسکے پرکشش لبوں کو چھو گئی۔

کیا اُس کا سیل نمبر اُسے صرف اُس پر غصہ کرنے کو ہی چاہیئے تھا؟

نو — اُس نے تردید کی۔ اُسے 'سوری' کہنے کو بھی چاہیے تھا۔ لیکن —

ایکبار پھر اُس نے اپنی تردید کی۔ اُس کا نمبر اُس کے پاس نہیں تھا۔ تو اُسے پھر غصہ آیا تھا۔ یعنی ایکبار پھر اُسے اُس کا نمبر اُس پر غصہ کرنے کے لئے ہی چاہیے تھا!

اُس نے کن انکھیوں سے زیب کو دیکھا۔ اتنی نازک سی پیاری سی لڑکی کیا اُس کے بار بار غصے کی متحمل ہو سکتی تھی؟

نہیں — دل نے کہا۔ یہ غصے تو اُس کے پیار کے ترجمان تھے۔ صرف پیار کے!

''مسئلہ ہے نا۔۔۔ کبھی چپ چپ رہتی ہو۔ کبھی اَپ سیٹ ہو جاتی ہو۔۔۔ کبھی گھبرا جاتی ہو۔ کبھی سہم جاتی ہو۔۔۔'' وہ بات چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

کچھ سمجھتی کچھ نہ سمجھتی وہ اب بھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

اچانک سنگین خان نے غور سے اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔

اَن کہی کہانیاں تھیں سنگین خان کی آنکھوں میں۔ اَن جانی داستانیں تھیں۔

اُسکی لمبی خمیدہ پلکیں تیورا کر گر گئیں۔ حسین چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔ پرکشش ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

جھکی جھکی نظریں لئے وہ اپنے خوبصورت ناخنوں سے کھیلنے لگی۔

وہ بے طرح محظوظ ہوا۔ نظریں پھر سے سڑک پر جما دیں۔

''کبھی نظریں چرانے لگتی ہو۔ کبھی اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگتی ہو۔'' اُس نے قدرے

توقف کیا۔ ''یہ سب syptoms ذرا۔۔۔ غور طلب ہیں۔ یوں ہی کھڑے کھڑے حل ہونے والے نہیں۔ اِس کے لئے کہیں مل بیٹھنا ضروری ہے۔ سو۔۔۔۔'' وہ دانستہ چپ ہو گیا۔

اُسکی نظروں سے شرارت تھی۔ آنکھوں میں شوخی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چپکے سے مسکرا دی۔ خود اُسکی جو symptoms تھیں۔ اُن کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا!

وہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

''کچھ بولو نا میم'' وہ دھیرے سے بولا۔

''کیا بولوں؟''

''آج تو بولنا پڑے گا۔'' وہ پھر اُسکی شربتی آنکھوں میں جھانکا۔ ''کوئی بات ہے جو تمہیں پریشان کئے ہوئے ہے۔ بول دو گی تو۔۔۔''

اور — اُس کی جان بوجھ کر یکطرفہ بات پر زور دینے پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

وہ چونکا۔ اُسکی ہنسی بہت پیاری تھی۔ بالکل جیسے کانچ کی چوڑیاں کھنکی ہوں!

وہ سمجھ گیا۔ وہ کیوں ہنسی تھی؟ مگر اپنی آئی ہنسی صاف چھپا لی۔

''ہوں — بولو نا'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا بولوں؟'' اُس نے پھر کہا۔ وہ بھی اب بتدریج حوصلہ پکڑ رہی تھی۔

''یہی کہ — تم۔۔۔ کیوں کھوئی کھوئی رہتی ہو؟ اَپ سیٹ اَپ سیٹ سی۔۔۔ اور۔۔۔''

''ایک بات پوچھوں؟'' زیب دھیرے سے بولی۔

''ہوں — پوچھو۔''

''آپ کیوں غصے غصے رہتے ہیں؟ جھنجھلائے جھنجھلائے پھرتے ہیں؟ کبھی گاڑی اتنی تیز چلاتے ہیں کہ لگتا ہے اب الٹی کہ اب۔ کسی کا فون نمبر بھی لینا چاہیں۔ تو لگتا ہے تھپڑ مار کر ہی لیں گے۔۔۔''

اور — سنگین خان کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔

''سوری، مگر۔۔۔ یہ سب symptoms بھی ذرا۔۔۔ غور طلب ہیں۔ بول دیں گے

تو۔۔۔''وہ بالکل اُسی کے لب و لہجے میں بول رہی تھی۔

سنگین خان کو اچھا لگا۔مزید ہنس دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔کچھ تم بولو۔کچھ میں بولوں گا۔تمہارا یہ مسئلہ آج۔۔۔''اُسے چھیڑنے میں اُسے مزا آرہا تھا۔

''آپکا مسئلہ بھی آج۔۔۔''

ایکبار پھر اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''او کے۔کچھ تم آگے بڑھو۔کچھ میں آگے بڑھتا ہوں۔یہ بات آج surface پر آجانی چاہیے۔۔۔''

''کون سی بات؟''وہ مُسکرا بھی رہی تھی۔

''یہی کہ— تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔اور— میں شاید تم سے۔۔۔''

''یہ آپ ہر بات مجھ سے ہی کیوں شروع کرتے ہیں۔میں بولوں۔میں آگے بڑھوں۔میں آپ سے پیار۔۔۔''وہ اپنی رو میں کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

وہ ہنس دیا۔خوبصورتی سے

''اچھا ٹھیک ہے۔میں بولتا ہوں۔میں آگے بڑھتا ہوں۔اور میں ہی— شاید۔۔۔تم سے پیار کرتا ہوں۔Happy?"

وہ چپ چاپ سامنے دیکھنے لگی۔

لنچ کا ٹائم ہو رہا تھا۔کچھ آگے جا کر سنگین خان مین روڈ سے بائیں طرف مڑ گیا۔پھر قریب ہی ایک پب کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کردی۔

اُس کا دروازہ کھولتے ہوئے اُسے ہاتھ سے تھامتا وہ پب کے اندر چلا گیا۔

دونوں ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔

ویٹر آیا۔تو سنگین خان نے زیب کی پسند پر چائینیز چکن چاؤمن اور اپنے لئے grilled steak with vegetable آرڈر کئے۔

ریسٹورانٹ کے کوزی اور خوشگوار ماحول میں دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

سنگین خان نے دیکھا۔زیب بہت کم کھا رہی تھی۔پہلی بار اُس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔شاید اس لئے کچھ نروس تھی۔

''کچھ کچھ تو بات کلیئر ہو رہی ہے۔''اُس نے اُسے باتوں میں لگانا چاہا۔کہ وہ کھانا کھا سکے۔

''کون سی بات؟''

''یہی— کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور میں۔۔۔''وہ اُسے چھیڑنے سے باز نہیں آرہا تھا۔

''میں؟''وہ اُسکی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

''اگر تم مجھ سے یوں ہی ملتی رہیں تو "I might fall in love with you some day".

"You might?"

"Yes I might."اُسکی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''خود ابھی کلیئر نہیں ہیں۔اور میرے بارے میں یقین سے کہہ دیا۔''

''کیوں؟ غلط کہا؟''ایکبار پھر وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اُس کی آنکھوں میں بے شمار قصے تھے،یاد دہانیاں تھیں۔

وہ سہار نہ سکی۔سیاہ جھالریں پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ اُسے دیکھتا رہ گیا۔اُسکی ہر ادا killing تھی!

وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔نظریں اوپر اٹھانے کی تاب نہ رہی تھی اُس میں!

وہ بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔کہ جتنا وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔اُتنا ہی وہ مشکل سے کھا رہی تھی۔

باہر کا منظر بدل گیا تھا۔اُودی اُودی گھٹائیں گھر آئی تھیں۔ہریالیاں تیز ہوا کی زد میں تھیں۔اور— وقت سے پہلے ہی شام نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔

''بارش ہونے والی ہے۔'' اچانک زیب بول اُٹھی۔

''اور اب یہ مت کہنا۔ کہ میں گھر جاؤں گی۔''

وہ دھیرے سے مسکرادی۔ اُس نے اُسکی پہلے کی کئی بار کہی بات دہرائی تھی۔

''گھر تو جاؤں گی نا۔''

''جب میں چاہوں گا تب جاؤ گی۔''

''آپ کب چاہیں گے؟''

''شام کو''۔

''نہیں۔'' وہ گھبرا گئی۔ ''کھانے کے بعد میں گھر چلی جاؤں گی۔''

''کھانے کے بعد تو نہیں۔ کیونکہ ہم بیچ پر جائیں گے۔ کچھ وقت وہیں گزاریں گے۔''

''کتنا وقت؟''

''بھئی مسئلہ تو حل ہونا۔۔۔''

''کون سا مسئلہ؟'' وہ جیسے بھول گئی تھی اُسکی بات۔

''وہی — جو تمہیں پریشان کئے رکھتی ہے۔''

زیب نے گہری سانس لی۔

''آپ بھی نا۔۔۔'' وہ کہتے کہتے ہنس دی۔

ایکبار پھر — جیسے پریوں کے دیس میں پائل بج اٹھے تھے۔

''تمہاری ہنسی بھی تمہاری طرح خوبصورت ہے۔''

''میں خوبصورت ہوں؟'' وہ جیسے غیر اِرادی طور پر بولی۔

وہ ہنس دیا۔ دلآویزی سے۔

''سوری، یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔''

''آپ بھی۔۔۔ بالکل ہینڈسم نہیں ہیں۔'' اس نے بدلہ لیا۔

''بالکل بھی نہیں۔''

وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔ ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس کے حسین ماتھے پر گھر آئی بالوں کی

لٹ آہستہ سے پیچھے ہٹائی۔

''تم — بہت خوبصورت ہو۔ بہت زیادہ۔۔۔''

اُس کے لہجے کی مدھرتا، نظروں کی گھمبیرتا زیب کو اپنے دل پر دستک دیتی محسوس ہوئی۔

''نظریں نیچی کئے وہ پلیٹ میں کانٹے سے کھیل رہی تھی۔

سنگین خان ایکبار پھر اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ کھانا تم نے ختم کرنا ہے۔ اِس سے پہلے میں نہیں اُٹھوں گا۔'' اُسے برائے نام کھاتے دیکھ کر اُس نے اُسکی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں کھانا کھا چکے۔ ریسٹورانٹ سے باہر آ گئے۔

بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے وہ اپنی گاڑی کی طرف چلا۔

''بارش ہو رہی ہے۔ بیچ پر جا کر کیا کریں گے''۔ گاڑی چلی۔ تو زیب بولی۔

اُسے واقعی گھر جانے کی جلدی تھی۔ وہ جب بھی سنگین خان کے ساتھ ہوتی تھی۔ ایک خوف سا لاحق رہتا تھا اُسے!

''بیچ پر ایسی covered جگہیں بھی ہیں۔ جہاں اطمینان سے بیٹھکر بیچ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔''

وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہی۔ کہ وہ اُس کی ایک بھی تو چلنے نہیں دے رہا تھا۔

پھر — وہ بیچ پر نہیں گئے۔ وہیں کچھ فاصلے پر مین روڈ سے قدرے ہٹ کر گھرے سبز درختوں میں گھرے ایک لیک کے کنارے گاڑی کھڑی کی۔ اور —

ٹپ ٹپ گرتی بوندوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

وہ جو چند روز قبل اُس کے پاس گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اُس نے خود سے وعدے کئے تھے، دھڑام سے گر گئے۔ وہ جو اُس نے اپنے دل سے کہا تھا پاس نہیں پھٹکے گی اُس کے، دل نے بھی جواب دے دیا۔ وہ جو اُس نے سوچا تھا، وہ تھا ہی کون اُسکا؟ سوچیں بھی مفلوج ہو گئیں۔

اِس وقت ایکبار پھر — وہ تھی اور سنگین خان!

"Should I tell you something?" سنگین خان گویا ہوا۔

رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے وہ اُسے دیکھنے لگی۔

"I love you." اُس نے اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے پرکشش ہونٹ اُس پر رکھ دیئے۔ "I Love you so much."

وہ گنگ سی رہ گئی۔ چپ چاپ اُسے تکتی رہی۔

اُس نے اُس کا سر اپنے پہلو سے لگالیا۔ اُس کے حسین چہرے پر گھر آئے بال سہلائے۔

اور— ہولے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

زیب خاموشی سے اُس کے پہلو سے لگی رہی۔ نہ مزاحمت کی نہ احتجاج۔ کہ وہ جیسے اِس انہونی پر ساکت سی رہ گئی تھی!

سنگین خان نے اُسے دونوں بازوؤں میں بھرلیا۔ دھیرے دھیرے پیار کرتا رہا۔ مدبھری سرگوشیاں کرتا رہا۔

اور پھر— زیب کو جیسے ہوش آیا۔ آہستہ سے اُس سے الگ ہوگئی۔

سنگین خان نے دیکھا۔ اُسکی خوبصورت آنکھیں نم تھیں۔

پھر— اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ بے اختیار رودی۔

سنگین خان دنگ سا رہ گیا۔ کیا وہ اُسے پسند نہیں کرتی تھی؟

''کیا ہوا زیب؟''

وہ روتی چلی گئی۔

''کیا بات ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟'' اُس نے اُس کے ہاتھ ہٹائے۔ باری باری اُسکی نم آنکھوں پر پیار کیا۔

''سنگین خان۔'' اُس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''مجھ میں اور آپ میں بہت فرق ہے۔ آپ کو بعد میں معلوم ہو۔ اور آپ مجھے چھوڑ دیں۔ وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ اِس لئے میں ابھی سے بتا رہی ہوں۔ آپ ایلیٹ کلاس سے ہیں۔ اور میں مڈل بلکہ لوئر مڈل کلاس سے ہوں۔ سو۔۔۔ بہتر ہوگا۔ آج ہی ہم دونوں اپنے راستے الگ کرلیں۔ آپ کہتے تھے نا' تم مجھ سے خوفزدہ کیوں ہو؟ تم مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرتیں'۔ تو۔۔۔ آپ خود سوچیں۔ اتنا بڑا فاصلہ ہو بیچ میں۔ تو میں کیسے خوفزدہ نہ

ہوں۔ کیسے ٹرسٹ کروں آپ پر؟''

''بس۔ کہہ دیا سب؟''

اُس کی طرف دیکھتے ہوئے زیب نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

اُس نے گہری سانس لی۔ دھیرے سے مسکرایا۔

''اب سنو'۔ ایکبار پھر اُس نے اُسے اپنے پہلو سے لگالیا۔ آہستہ آہستہ اُس کے بال سہلانے لگا۔ ''مجھے ایلیٹ کلاس کی لڑکی نہیں چاہیے۔ مجھے تم چاہیے ہو۔ صرف تم۔ کلاسز کی بات اتنی اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمارا دل کیا چاہتا ہے۔ اور پھر— مجھے اگر کسی ایلیٹ کلاس کی لڑکی سے انگیجمنٹ ہوبھی جاتی۔ تو میں سو بار سوچتا ضرور۔ کیونکہ ہماری ایلیٹ کلاس لڑکیاں آج کل ویسٹ کو بھی مات دیتی نظر آتی ہیں۔ اور مجھے لڑکیوں کی بے باکی اور حد سے زیادہ آزادی پسند نہیں ہے۔۔۔'' اُس نے قدرے توقف کیا۔ پھر مسکرایا۔ ''مجھے صرف تم اچھی لگتی ہو بس۔ تم جو بھی ہو۔ جیسی بھی ہو۔۔۔''

''اور۔۔۔ اِسکی کیا گارنٹی ہے۔ کہ آپ بدلیں گے نہیں۔ اِسی طرح رہیں گے۔'' وہ اپنی سرخ متورم آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

زینیہ کا کیس بہرحال اُس کے سامنے تھا!

''تم تسلی رکھو۔ میں نہیں بدلوں گا۔ بدلنا ہوتا تو اُس دن بدل جاتا جس دن تم نے میرا وزٹنگ کارڈ مجھے واپس لوٹایا تھا۔۔۔''

وہ نادم سی لگنے لگی۔

''تمہیں پتہ ہے مجھے کتنا دکھ ہوا تھا وہ کارڈ دیکھکر؟'' اُسکی سیاہ نشیلی آنکھیں لو دینے لگی تھیں۔ اِس وقت بھی دکھ اُتر آیا تھا اُسکی آنکھوں میں۔

وہ بھی بیقرار ہوگئی۔ بے چین ہوگئی۔

پھر— آہستہ سے اپنا پرس کھولا۔ سیل فون نکالا۔

''آپ۔۔۔ اپنا سیل نمبر دیں گے مجھے؟'' اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر بہت پیاری مسکان تھی۔

سنگین خان نے گہری سانس لی۔ دھیرے سے مسکرایا۔

''دیدوں گا۔ ویسے بھی پہلی کال تم ہی کرو گی۔ دیکھتا ہوں کب بھروسہ کرتی ہو مجھ پر۔''

وہ چپکے سے مسکرادی۔ اور—

سنگین خان نے اپنا سیل نمبر اُس کے سیل فون پر منتقل کر دیا۔

زیب نے ایک نظر اپنے سیل پر اُس کے نمبر پر ڈالی۔ اب بھی ڈرتے ڈرتے اِس اُمید کے ساتھ کہ وہ زینیہ کے اُس لڑکے کی طرح بے وفا نہیں نکلے گا!

ویسے تو تمام سال سٹی سینٹر میں نمائشیں، آؤٹ ڈور تھیٹرز، میوزک، ڈانس، کومیڈی اور میجک شوز چلتے رہتے تھے۔ مگر آجکل تو سٹی تھیٹرز اور آرٹ وینیوز پر بہترین ڈراموں، ڈانس اور میوزک کا سیلاب آیا ہوا تھا۔

'برائیٹن ڈوم' میں ورلڈ میوزک، اوپرا اور بیلے ہو رہی تھی۔

'رائیل تھیٹر' میں پاپ سٹارز پرفارم کر رہے تھے۔ اور— سینماؤں میں ہالی ووڈ کی بہترین فلمیں دکھائی جا رہی تھیں۔

ویک اینڈ تھا۔ زیب، آصفہ اور کاشف بھی فلم دیکھنے چلے گئے۔

صاف ستھرے ہال میں آرام دہ سیٹس پر بیٹھے خوشگوار ماحول میں وہ تینوں فلم دیکھنے میں محو

تھے۔

فلم ختم ہوئی ہی تھی۔ وہ لوگ باہر نکلے ہی تھے۔ کہ زیب کا سیل فون بج اُٹھا۔

وہ آصفہ اور کاشف سے قدرے ہٹ کر بات کرنے لگی۔ کہ کال سنگین خان کی تھی۔

جانے کیسے؟ آصفہ نے کچھ تاڑ لیا۔ فون بند کر کے وہ اُن کے پاس آئی۔ کاشف ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ وہ اور آصفہ پچھلی سیٹ پر۔ تو آصفہ مسکرادی۔

''Hey cousine. کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔'' اُس نے زیب کو چھیڑا۔

''ن۔۔۔نہیں تو۔'' زیب گھبرا سی گئی۔

''اچھا ریلیکس۔ گھر جا کر بات کریں گے۔''

اور گھر جا کر — اِس خیال سے کہ نازیہ اور نواز صاحب ڈسٹرب نہ ہوں۔ اُن لوگوں نے دبے قدموں چل پھر کر کچن میں کھانا کھایا اور اپنے اپنے بیڈ رومز میں گھس گئے۔ زیب اور آصفہ نے کپڑے تبدیل کئے اور اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔

''زیب۔ بتاؤ گی نہیں کون ہے؟'' آصفہ چہک ہی پڑی۔

وہ برائیٹن کے آزاد ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ زیب اور خالہ، خالو کی طرح قدامت پسند نہیں تھی۔ کسی کو پسند کرنا اُسے معیوب نہیں لگتا تھا۔ ہاں — فلرٹیشن کی وہ بھی قائل نہیں تھی۔

''کوئی ہو تو بتاؤں گی نا'' زیب مسکراتے ہوئے بولی۔

''تمہارے چہرے کی دمک، تمہارے لہجے کی چہکار بتا رہی ہے۔ کہ کوئی ہے۔ منہ سے نہ کہو تمہاری مرضی۔''

''نہیں۔ بتاتی ہوں۔'' وہ جلدی ہی رضا مند ہوگئی۔

کہ — اُس کے بھی ذہن پر کافی دنوں سے بوجھ تھا۔ وہ بھی یہ بوجھ کسی سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ صرف آصفہ ہی ہوسکتی تھی۔ دونوں تھیں ہی بہت کلوز۔ دو مختلف ممالک میں ہوتے ہوئے بھی ایکدوسری کی ہمدم و ہمراز تھیں۔ ہر بات ایکدوسری سے شیئر کرلیا کرتی تھیں۔ اِس بات نے تو پھر زیب کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ بتا دینا چاہیے تھا اُسے آصفہ کو۔ آصفہ پر اُسے پورا اعتماد تھا۔ آخر تو آج تک وہ زینیہ کا بھی راز دل میں چھپائے ہوئے تھی۔

''بتاؤ پھر۔''

''وہ۔۔۔سنگین خان ہے نا۔۔۔''

''اسکا فون آیا تھا؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''ہاں۔''

آصفہ مارے تجسس کے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''بتاؤ بتاؤ۔ اُس سے کیسے ٹکر ہوئی؟ پوری بات بتاؤ۔''

''اچھا اچھا۔ تم دم تو لو۔'' اُس نے بھی کروٹ آصفہ کی طرف لے لی۔

پھر — من و عن ساری بات بتادی۔

''میں نے بہت کوشش کی اُسے discourage کرنے کی۔ ٹالنے کی۔ مگر۔۔۔نہ وہ پیچھے ہٹا۔ نہ ہی میں خود کو مزید روک سکی۔ ہاں یہ سوچ کر جان ضرور نکل جاتی ہے۔ کہ امی اور ابو کو پتہ چل گیا تو قیامت آجائے گی۔۔۔''

''کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ اور اگر تمہیں یقین ہے۔ کہ سنگین خان سیریس ہے تو اُسے کہو۔ کہ پاکستان جائے۔ تو تمہارا رشتہ لیکر آئے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ رشتہ لیکر جانا تو عزت دینا ہوتا ہے۔ فوزیہ خالہ اور فیاض خالو کو اِس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ رشتہ بھیجے گا۔ تو مما اور ڈیڈ بھی فوزیہ خالہ اور فیاض خالو کو سمجھائیں گے۔۔۔'' وہ قدرے رُکی۔ ''ویسے تم نے اچھی خبر سنائی ہے۔ اب میں بھی تمہیں خوش خبری سنادوں کہ مما اور ڈیڈ میری بات بھی مان گئے ہیں۔ ابرار اِس ویک اینڈ پر اُن سے ملنے آرہا ہے۔۔۔''

ابرار احمد انڈین مسلمان تھا۔ دونوں یونیورسٹی میں Law پڑھ رہے تھے۔ ابرار کا آخری سال تھا۔ جبکہ آصفہ ایک سال جونیئر تھی اُس سے۔ دونوں ایکدوسرے کو پسند کرتے تھے۔ پچھلے دنوں اُسکی والدہ اُسکا رشتہ بھی لیکر آئی تھیں۔ بس آصفہ کو مما اور ڈیڈ کو راضی کرنا تھا۔ سو مان ہی گئے وہ بھی۔

''واؤ۔ یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' وہ شاکی لہجے میں بولی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے جب ہم لوگ مووی دیکھکر واپس آرہے تھے۔ تو راستے میں مما نے مجھے سیل پر میسیج دیا۔ میں نے سوچا۔ ڈنر کے بعد سوتے وقت تسلی سے تمہیں بتاؤں گی۔۔۔''

''صرف بتاؤ گی نہیں۔ ٹریٹ لیں گے میں اور کاشف۔''

''ضرور۔ بس ویک اینڈ پر ابرار کو آنے دو۔ پھر جو چاہو گے تم لوگ۔ دوں گی۔'' وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔

''آصفہ۔''

''ہوں۔''

''پتہ نہیں کیوں؟ سنگین خان کی بہت تسلیوں کے باوجود مجھے کبھی کبھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ کہیں وہ بدل گیا تو؟''

''نہیں بدلے گا۔ وہم ہے تمہارا۔''

''یہ نہ ہو کہ وہ کسی اور سے دوستی کر لے۔ اور میں دل میں اُسے ہی لئے رہ جاؤں۔''

''کیوں سوچتی ہو ایسا۔ مجھے پتہ ہے تمہیں زینیہ کے بوائے فرینڈ کا خیال آتا ہے۔۔۔''

''ساتھ میں یہ بھی۔ کہ میں مار ڈالوں اُس لڑکے کو۔ جس کی وجہ سے میری بہن مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔ اتنی کم عمری میں اُسے مار ڈالا۔ اپنی زندگی تک پوری کرنے نہیں دی۔۔۔''

اِس وقت پھر وہ اُداس ہو گئی۔ لیکن — وہ بھولی ہی کب تھی اُسے؟ کتنے پیارے رشتے ہوتے ہیں۔ ادھورا رہ جاتا ہے انسان!

''دیکھو زیب۔'' اُس نے اُسے پیار سے اپنے قریب کر لیا۔ زینیہ کو اللہ تعالیٰ نے حسین جنت میں جگہ دی ہو گی۔ وہ بہت خوش ہو گی وہاں۔ تم بس دل کو یہ تسلی دو۔ کہ وہ وہاں خوش ہے اور باقی سب بھول جاؤ۔۔۔''

''لیکن آصفہ۔ دل میں درد بہت اٹھتا ہے جب وہ یاد آتی ہے تو۔'' وہ بے اختیار رو دی۔

آصفہ کی بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔ زینیہ کو وہ خود نہیں بھول پائی۔ تو زیب کیا بھول پاتی!

تبھی — وہاں سے نازیہ کا گزر ہوا۔ کچن جا رہی تھیں غالباً۔

اُن دونوں کو جاگتے دیکھا۔ تو دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔

''ابھی تک جاگ رہی ہو تم لوگ؟''

''مما آئیں بیٹھیں نا۔'' آصفہ بولی۔ اُس سے جیسے اکیلے زیب سنبھل نہ پا رہی تھی۔

''پتہ ہے کیا ٹائم ہوا ہے؟'' وہ وہیں سے بولیں۔ ''دو بج چکے ہیں۔ سو جاؤ شاباش۔''

''مما آئیں نا۔'' آصفہ پھر بولی۔ ''زیب آج پھر رو رہی ہے۔ زینیہ یاد آ رہی ہے اِسے۔''

''اوہ۔'' وہ فوراً اندر آ گئیں۔

زیب کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ اُسکا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''نہیں بیٹا۔ رؤو نہیں۔ کاش کہ وہ ہمارے رونے سے واپس آ سکتی۔'' اُن کی بھی آواز بھرا گئی۔ بے اختیار آنسو نکل آئے۔

پھر — اُسے بہت ساری تسلیاں دیں۔ ڈھارس بندھائی۔ دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

''تمہیں آصفہ نے بتایا ہے۔ اِس ویک اینڈ پر ابرار آ رہا ہے۔۔۔''

''جی۔'' وہ آہستہ سے مسکرا دی۔

''اب کیا کریں۔ اِسکو پسند ہے۔ تو ہمیں بھی پسند کرنا ہی ہو گا۔'' وہ آصفہ کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

''خالہ بس اللہ کرے آصفہ خوش رہے۔ اِسی میں آپکی اور ہم سب کی خوشی ہے۔''

''ہاں بیٹا۔ میں نے اور تمہارے نواز خالو نے بھی یہی سوچا ہے۔ کہ اگر یہ دونوں خوش ہیں۔ تو ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔''

''اچھا ہے نازیہ خالہ، آصفہ کی بدولت ہم بھی شاید انڈیا دیکھ لیں۔''

آصفہ نے ہی تو اُسے بتایا تھا۔ کہ ابرار کی فیملی بے شک کہ یہاں مقیم ہے۔ مگر وہ لوگ انڈیا جاتے آتے رہتے ہیں۔

''ہاں۔ اور پھر شادی تو ہو گی ہی انڈیا میں۔'' نازیہ نے ابرار کی والدہ کا پروگرام بھی اُنہیں سنایا۔

''اِس کا مطلب ہے آپ لوگ بھی پاکستان آئیں گے۔'' زیب ایکسائیٹڈ سی بولی۔

''ظاہر ہے جانا پڑے گا۔ وہیں دونوں فیملیز کو convinient رہے گا۔''

آصفہ بے اختیار زیب سے لپٹ گئی۔

''دیکھا خالہ۔ آصفہ کتنی خوش ہو رہی ہے۔'' زیب نے اُسے چھیڑا۔

''شادی پر نہیں۔ پاکستان جانے پر خوش ہو رہی ہوں۔''

''اچھا؟ شادی پر خوش نہیں ہو؟'' زیب پھر چہکی۔

''دیکھو زیب۔'' وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ ''تنگ مت کرو ورنہ۔۔۔''

اُس کے لہجے میں دھمکی تھی اور — زیب کی جان ہی تو نکل گئی۔ کہیں وہ سنگین خان کی بات تو نہیں بتانے والی تھی؟

''ٹریٹ نہیں ملے گی پھر۔'' آصفہ نے بات پوری کی۔

اوہ — اُسکی جان میں جان آ گئی۔

''اور بس اب سو جاؤ۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔'' نازیہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

اِس کے باوجود — آصفہ ابرار کے بارے میں اور زیب سنگین خان کے بارے میں دیر تک باتیں کرتی چلی گئیں۔ اور وقت گزرتا چلا گیا۔

آج پہلی بار وہ سنگین خان کے بلانے پر اُس سے ملنے آ رہی تھی۔ آصفہ کو بھی بتا چکی تھی۔ مطمئن سی تھی کچھ۔

وہی گھر کے اوپر والے بس سٹاپ پر آئی ہی تھی کہ سنگین خان اُسے پک کرنے آ گیا۔

پیسنجرز سیٹ پر اُس کے بیٹھتے ہی سنگین خان آگے بڑھا۔

''آج کہیں نہیں جائیں گے۔'' سنگین خان نے ابتداء کی۔ ''بس لونگ ڈرائیو پر چلتے چلے جائیں گے۔ بھوک لگے گی۔ تو راستے میں کچھ کھا لیں گے۔ اور پھر — آگے جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''آج سارا دن اپنا ہے۔'' مسرور سا وہ مزید بولا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حسبِ عادت گھبرا گئی۔

اُسے ہنسی آ گئی۔ اُس کا ڈر کس طرح کم ہو ہی نہیں رہا تھا۔

''مطلب یہ کہ۔۔۔آج سارا دن تم میرے ساتھ رہو گی۔۔۔رات تک۔۔۔'' وہ بات چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

''بالکل نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے آپ کے ساتھ گزار سکتی ہوں اور بس۔'' یہی تو وہ سوچ کر گھر سے نکلی تھی۔

''چلو۔ دیکھتے ہیں۔'' سڑک پر نظریں جمائے وہ لاپروائی سے بولا۔

''نہیں۔ دیکھتے نہیں ہیں۔'' اُسکی لاپروائی سے وہ شک میں پڑ گئی۔ ''صرف تین گھنٹے اچھا۔''

اُس نے گہری سانس لی۔

''اچھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر — اُس نے گاڑی آبادی سے باہر جاتی سڑک پر ڈال لی۔

دائیں جانب اونچی نیچی ہری بھری پہاڑیاں تھیں۔ بائیں جانب دور دور تک درخت تھے، سبزہ تھا، اور — اُن کے اُس پار پُر جلال سمندر رواں دواں تھا۔

وہ دھیمی رفتار سے پتلی سیاہ بل کھاتی سڑک پر آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

پھر — اُس نے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر لیا۔

اُسے یہ راستہ بہت پسند تھا۔ خاموش اور پُرسکون!

جب بھی وہ اِس راستے پر ہو لیتا۔ جہان بھر کی خوشبوئیں لئے شبنمی ہوائیں اُسے اپنا استقبال کرتی محسوس ہوتیں۔

''کتنا خوبصورت راستہ ہے۔ چپ چاپ سا، پرسکون سا۔'' زیب متاثر سی بولی۔

''چپ چاپ سا ہے۔ مجھ سے ڈر تو لگتا نا؟'' اُس نے اُسے چھیڑا۔

وہ جو بات بات پر چونک جاتی تھی۔ گھبرا جاتی تھی، سہم جاتی تھی!

وہ بے اختیار ہنس دی۔

وہی پریوں کے دیس میں بجتے جھانجھروں کی سی ہنسی!

''تم زیادہ خوبصورت ہو یا۔۔۔تمہاری ہنسی، ہاں۔'' وہ مسحور سا بولا۔

وہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ اُسکی جادوگر سائل اور اُسکے طلسم جگاتے قہقہے اُسے بھی پہروں مسحور رکھتے تھے۔ مگر کہہ نہ پائی۔ خاموشی سے سامنے دیکھتی رہی۔

''کچھ بولو نا مَیم۔''

مگر — کچھ بھی بولے بنا وہ چپ چاپ اُسے تکنے لگی۔

''باپ رے۔ ہنسی چھوڑو۔ یہ بتاؤ تمہاری آنکھیں کیوں اتنی زیادہ خوبصورت ہیں؟'' وہ اُسکی بڑی بڑی شربتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں۔'' اُسکی سیاہ جھالریں پلکوں نے اُسکی آنکھوں پر چلمن گرا دی۔

وہ بے طرح محضوظ ہوا۔

''من عاشقِ چشمِ مستِ یاراستم
پیانہ بدے کہ خماراستم''

بے ساختہ اُسکی زبان پر اُس کا بے حد پسندیدہ فارسی شعر مچلا۔

وہ کچھ مطلب سمجھی اور کچھ نہیں سمجھی۔

''کیا مطلب ہے اِسکا؟'' اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

اُس نے اُسکی دونوں آنکھوں پر باری باری پیار کیا۔ پھر مطلب بتا دیا۔

"I'm in love with my beloved's intoxicating eyes.
Bring me the glass so I may lose myself."

سرخ سی ہوتی وہ پھر سے سامنے دیکھنے لگی۔

یہ سوبر اور اِمپوزنگ آدمی خوبصورت باتیں کرنا جانتا تھا!

سنگین خان نے ایکبار پھر نظریں سامنے جما دیں۔

سیاہ ناگن سی بل کھاتی سڑک، جھکے جھکے بادل اور — بے تحاشہ ٹھنڈ!

وہ مسحور سا آگے بڑھ رہا تھا۔

''موسم اچھا ہے نا؟''

''ہاں۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''بادل اچھے ہیں نا؟''

''ہاں۔''

''میں اچھا ہوں نا؟''

تو —— یہ ساری ہیر پھیر اس لئے تھی!

ایکبار پھر —— وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''نہیں۔''

اب کے اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''تمہیں پتہ ہے میرے بابا کیا کہتے ہیں؟'' سنگین خان نے کہا۔

پہلی بار وہ اپنے خاندان کی اور شاید اپنے والد کی بات کر رہا تھا۔ اُس نے رخ اُسکی طرف کر لیا۔ توجہ سے سننے لگی۔

''کیا کہتے ہیں؟'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

''بابا کہتے ہیں۔ کہ اُن کی بہو خوبصورت ہونی چاہیے۔''

اور —— زیب کے حسین چہرے پر لالی سی دوڑ گئی۔

''کیا کہوں اُن سے، ہاں؟'' اُسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ مزید بولا۔

اُسکی لمبی خمیدہ پلکیں تیورا کر گر گئیں۔ بولی کچھ نہیں۔ کہتی بھی کیا؟

اُسے اچانک کچھ عرصہ قبل میریٹ میں نائلہ کا حلیہ یاد آیا۔ اُس کا اُسکے بوائے فرینڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا یاد آیا۔

کتنا فرق تھا دونوں لڑکیوں میں؟ ایک کی آنکھیں ذرا سی بات پر حیا سے جھک جاتی تھیں۔ دوسری کی آنکھیں بے باکی سے غیر لڑکے کی آنکھوں میں گڑی رہتی تھیں۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں؟'' اُس نے نگاہیں واپس سڑک پر جما دیں۔

''بتائیں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''میری منگنی ہو چکی ہے۔۔۔'' اُس نے بتا دینا ضروری سمجھا۔

''جی؟'' اُس کا جیسے دم آنکھوں میں آ گیا۔

کیا وہ اُس کے ساتھ یوں ہی فلرٹ کر رہا تھا؟ کیا زیبیہ کی طرح۔۔۔؟

ایکبار پھر اُسے زیبیہ کا خیال آیا۔

''تم تو اَپ سیٹ ہو گئیں۔ میری پوری بات تو سنو۔''

وہ چپ چاپ اُسے دیکھنے لگی۔ اب کیا بتانے لگا تھا وہ؟

''وہ میری کزن لگتی ہے۔ لیکن اُس کے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ میں اُس کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ اندیشوں نے ضرور آلیا۔

سنگین خان خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر —— چونکا۔ زیب کھڑکی کی طرف رخ کئے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ آہستہ سے اپنے ہونٹوں سے اُسکا ماتھا چھوا۔

''اُس کے ساتھ میری بات ختم ہو چکی ہے۔ کافی وقت سے میں نے اُسے دیکھا تک نہیں۔ مگر تمہیں اندھیرے میں رکھنا مجھے مناسب نہیں لگتا تھا۔ اِس لئے بتا دیا۔''

پھر —— وہ اُسکی بھیگی بھیگی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکرایا۔

اُسکی مسکراہٹ میں شوخی تھی۔ شرارت تھی۔

''مجھے کیا پتہ تھا۔ کہ تم مجھے اتنا چاہتی ہو۔ کہ کسی اور لڑکی کا ذکر تک برداشت نہیں کر پاؤ گی۔'' وہ مزید بولا۔

''میں نہیں چاہتی آپکو۔'' وہ روتے میں مسکرا دی۔

''نہیں چاہتیں؟''

''نہیں۔''

''سوچ لو۔''

''سوچ لیا۔''

''پھر سوچ لو۔''

''پھر سوچ لیا۔''

''تھوڑا سا اور۔'' وہ اُسے تنگ کیے جا رہا تھا۔

''بہت سوچ لیا۔ نہیں چاہتی میں آپکو۔'' وہ روٹھی روٹھی سی بولی۔

''پکی بات ہے؟''

''ہاں۔''

''پھر میرے کندھے سے کیوں لگی ہو؟''

''بس لگی ہوں۔''

''ہٹ جاؤ۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''میری مرضی۔'' وہ پھولے پھولے منہ کے ساتھ بولی۔

اور — سنگین خان نے اُسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ بے تحاشہ پیار کرنے لگا۔

وہ اُس کے دل کی دھڑکنیں اپنی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکتیں سنتی رہی۔ اُسکی مہکتی سانسیں اپنی سانسوں میں گڈمڈ ہوتیں محسوس کرتی رہی۔ اُس کی مخصوص پرفیوم کی اروما اُسے خود سے بے کرتی رہی۔

اور — گھڑیاں دھیرے دھیرے بیتتی رہیں۔

معاً — پیچھے سے ہلکا سا ہارن ہوا۔ اور — سنگین خان ہوش میں آ گیا مدہوشی میں وہ ا لین سے کھسک گیا تھا۔ پچھلی گاڑی کا راستہ رُک رہا تھا۔

وہ دوبارہ بائیں طرف ہو گیا۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ اور وہ پھر سے آگے بڑھنے لگا۔

''کچھ کھالیں؟'' اُس نے زیب سے پوچھا۔ کہ —

دوپہر کا ایک بج چکا تھا!

''ابھی نہیں''۔

''ٹھیک ہے۔''

''آپکو یاد ہے نا۔ میں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے گزار سکتی ہوں آپکے ساتھ۔''

اور — ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا ہے۔''

''ہاں۔''

''صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔''

''ہاں۔''

اُس نے گہری سانس لی۔

اُودی گھٹائیں بوجھل ہو رہی تھیں، نوخیز ہریالیاں تیز ہوا سے جھکی جا رہی تھیں۔ اور — سردی سوا ہو گئی تھی!

''میں نے سنا ہے۔ کہ آتے اپنی مرضی سے ہیں۔ اور جاتے دوسرے کی مرضی سے ہیں۔''

''میں correction کروں؟''

''ہاں۔'' وہ دلآویزی سے ہنس دیا۔

''مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے۔ اور جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔''

''دونوں میں کیا فرق ہے؟''

''یہی کہ ۔۔۔ نہ میں مہمان ہوں، نہ آپ میزبان۔''

''مہمان نہیں ہونا؟''

''نہیں۔''

''پھر اتنا تکلف کیوں ہے؟''

چند ثانیے وہ چپ رہی۔ جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔

''تکلف نہیں ہے۔ ڈر لگتا ہے میں کسی غیر مرد کے ساتھ اِس طرح گھر سے باہر نہیں

رہی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ڈرومت۔ میں تمہیں صحیح سلامت تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔'' مسکراتے ہوئے سامنے تکتا وہ دھیرے سے بولا۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟''

''اب ہنسی پر بھی پابندی لگاؤ گی؟'' وہ کُھل کر ہنس دیا۔

''نہیں لیکن۔۔۔'' پتہ نہیں کیوں وہ اُسکی ہنسی پر بھی شاکی سی تھی۔

اُس نے گہری سانس لی۔

''مجھے ہنسی اِس لئے آئی۔ کہ تمہیں صحیح سلامت گھر چھوڑتے کہتے ہوئے مجھے یوں لگا۔ کہ تم کوئی کیک قسم کی چیز ہو۔ اور میں تم سے کوئی پیس نہ کاٹ لوں۔۔۔''

زیب کو بھی ہنسی آگئی۔

''اب تم کیوں ہنسی ہو؟''

''اب ہنسی پر بھی پابندی لگائیں گے کیا؟'' اُسکی کاپی کرتے ہوئے وہ مزید ہنس دی۔

''نہیں لیکن۔۔۔'' اُس نے بھی اُسے کاپی کیا۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ اب وہ لوگ سمندر کے قریب سے گزر رہے تھے۔

اکادکا بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ کُہر ہی کُہر تھی چاروں طرف۔ راستہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا!

اُس نے ہیڈ لائیٹس آن کر دیں۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

''راستہ نظر ہی نہیں آرہا۔'' زیب بولی۔

وہ ہنس دیا۔ دلآویزی سے۔

''اب کیا ہوگا؟'' اُس کا لہجہ تشویشناک ہوگیا۔

وہ سمجھ گئی۔ وہ اُسے جلدی گھبرا جانے پر چھیڑ رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' اُس نے کہا۔

''واؤ ۔۔۔ کتنی بولڈ ہوگئی ہو۔ صحبت کا اثر ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آپ سچ کہتے ہیں۔'' اُسے ماننا پڑا۔ اُسی کی ہمت بندھانے سے ہی وہ حوصلہ پکڑ پائی تھی۔

''میں نے پہلے بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' اُسکی شکل مسکین ہوگئی۔

وہ ایکبار پھر ہنس دی۔ سر اُس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

''آپ۔۔۔ بہت اچھے ہیں۔''

''تمہیں آج پتہ چلا؟''

''نہیں۔ مجھے صرف ابھی پتہ چلا ہے۔'' اُس نے اُسے چھیڑا۔

''ویسے۔۔۔ تم بالکل اچھی نہیں ہو۔''

''آپ کو آج پتہ چلا؟''

''نہیں۔'' اُسکی شکل مزید مسکین ہوگئی۔ ''مجھے صرف ابھی پتہ چلا ہے۔''

وہ چپکے سے مسکرا دی۔ اُس کے انداز میں جادو بول رہا تھا!

کچھ آگے چل کر ۔۔۔ سنگین خان نے گاڑی ایک روڈ سائیڈ ریسٹورانٹ کی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔

زیب گاڑی میں ہی بیٹھی رہی۔ وہ اندر گیا۔ کھانا پیک کروایا۔ اور واپس گاڑی میں آبیٹھا۔

تھوڑا آگے جا کر اُس نے ایک برانچ روڈ لی۔

اب تاحدِ نظر وسیع و عریض ہری بھری اُبھری اُبھری چراگاہیں تھیں۔ اور یہاں وہاں ٹولیوں میں چرتیں سفید سفید مُنی مُنی بھیڑیں۔

چلتے چلتے ایک خوبصورت تنہا گوشے میں آ کر اُس نے گاڑی روک لی۔

دونوں اُتر کر باہر نکلے۔ قریب ہی ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھے۔ اور اپنا اپنا لنچ نکال کر کھانے لگے۔

چاروں اُور ہریالیاں تھیں۔ جھک جھک آتیں سیاہ گھٹائیں تھیں۔ اور ۔۔۔ وقت سے پہلے

ہی شام گھر آئی تھی!

''یہاں بس ایسا ہی موسم رہتا ہے۔'' سنگین خان نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''بہت پیارا موسم ہے یہاں کا۔'' زیب بولی۔

''اور میں؟''

وہ بے اختیار ہنس دی۔

''نہیں۔۔۔آپ ایسے نہیں ہیں۔''

''یعنی میں پیارا نہیں ہوں۔''

''میں نے یہ نہیں کہا۔ میں کہتی ہوں آپ اِس موسم جیسے نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''موسم تو بدلتا رہتا ہے۔ آپ نہیں بدلیں گے۔۔۔''

''اور اگر بدل گیا تو؟''

''آپ تو کہتے تھے۔ آپ نہیں بدلیں گے؟ وہ کھانا وانا چھوڑ آس اور یاس کے عالم میں اُسے دیکھنے لگی۔

''باپ رے۔ تم کتنی جلدی مائینڈ کر لیتی ہو۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

''پلیز مجھے مذاق میں بھی ایسا مت کہیں۔'' ساتھ ہی اُسکی حسین آنکھیں نم ہوگئیں۔'' میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔

''اوہ۔'' اُس نے اُسے اپنے پہلو سے لگالیا۔ ''پھر ایسا نہیں کہوں گا۔ کھانا کھا شاباش۔'' اُس نے اُسے اُسکا سینڈوچ پکڑایا۔

وہ دھیرے دھیرے کھانے لگی۔

''تم کتنی فریجائیل ہو۔ اتنی نازک۔۔۔''

''بس ایسی ہی ہوں۔'' وہ ہولے سے بولی۔

تھوڑی دیر دونوں طرف سکوت چھایا رہا۔ دونوں نے ہی اپنا اپنا کھانا کھالیا۔ پیپر نیپکن سے ہاتھ صاف کیئے۔ اور وہیں درخت کے موٹے سے تنے سے ٹیک لگائے آس پاس کے جادو

موسم سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

پھر — سنگین خان اُٹھا اور چوکلیٹس لینے گاڑی کی طرف بڑھا۔

عام سی بیج کلر ٹراؤزرز، ہاف لینتھ ڈرٹی گرین گرم لائیننگ والے رین کوٹ میں ملبوس — اٹل خوداعتمادی لئے وہ مقناطیسی شخصیت کا حامل تھا!

زیب اپنی قسمت پر ناز کرنے سے پہلے ہی ڈر کر رہ گئی۔ کیا وہ اُسے واقعی مل سکتا تھا؟

وہ چوکلیٹس لے آیا۔ درخت کے تنے سے دوبارہ ٹیک لگاتے ہوئے ٹانگیں سیدھی پھیلائیں۔ ساتھ ہی زیب کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

زیب سب اندیشے بھلاتے ہوئے اُسکی قربت سے لطف اندوز ہوتی، چوکلیٹس کھانے لگی۔

''آپکی منگیتر کیسی ہے؟'' زیب نے اچانک پوچھا۔

اور — سنگین خان کی آنکھوں میں شرارت اُتر آئی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ لاپرواہی سے بولا۔

''میں نے اُسکی طبیعت نہیں پوچھی۔'' وہ جیسے جل کر بولی۔

''پھر؟'' وہ اپنی ہنسی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں۔''

وہ چند پل خاموش رہی۔ بے کل سی آس پاس تکتی رہی۔

''شکل کیسی ہے؟'' وہ دوبارہ بولی۔

''کون؟'' وہ انجان بن گیا۔

''آپکی منگیتر اور کون۔''

''وہ تو اب ختم ہوگئی ہے نا۔'' وہ اب بھی اپنی ہنسی چھپا رہا تھا۔

''کیا پتہ۔''

''کیا مطلب کیا پتہ؟''

''اچھا چھوڑیں۔ اُس کے علاوہ کتنی گرل فرینڈز رہی ہیں؟''

''اُم م م۔'' وہ واقعی سوچنے لگا۔ ''تین یا چار۔۔۔''

''کتنے بڑے فلرٹ ہیں آپ۔'' وہ جیسے بڑے ضبط سے بولی۔

''اتنا بھی نہیں۔''

''کیوں؟ اِس سے زیادہ ہونی چاہیے تھیں؟''

''نہیں۔'' اُسکی شکل مسکین ہوگئی۔

وہ چند ثانیے پھر چپ رہی۔ اور—

سنگین خان سامنے نظریں جمائے چپکے سے ہنس دیا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں۔'' وہ آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

''کیا اِن میں سے ہر لڑکی آپکو پسند تھی؟''

''کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے اتنی لڑکیوں سے بار بار تو محبت ہو نہیں سکتی۔۔۔''

''کیسی بات کرتی ہو۔ مجھے تو ہر ایک سے ہر بار محبت تھی۔۔۔''

''آپکا دل ہے یا۔۔۔'' اُس کے لہجے میں دور کہیں طنز اُبھر آیا تھا۔

سنگین خان نے گہری سانس لی۔

''واقعی۔ مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے۔ دراصل۔۔۔ میں بہت نرم دل واقع ہوا ہوں۔ جو بھی لڑکی قریب آئی۔ اُس سے ہمدردی ہوگئی۔۔۔''

''ہمدردی یا محبت؟''

''وہی — محبت۔ اصل میں لڑکی ہے ہی ایسی چیز کہ۔۔۔ نرمی سے، محبت سے ہینڈل کرنا پڑتا ہے۔۔۔''

''اور اب۔۔۔ میری باری ہے؟'' اُس نے اُسکا ہاتھ پرے ہٹا دیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''پلیز! میں مذاق کر رہا تھا۔ تنگ کر رہا تھا تمہیں۔''

اُس نے دوبارہ اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اُس کے احتجاج کی پرواہ کئے بغیر!

پھر— جھکا اور اُسکی آنکھوں پر اپنے پرکشش ہونٹ رکھ دیئے۔

زیب نے جھٹ سے اپنی آنکھیں اپنے بازو سے ڈھک لیں۔ وہ اب بھی اُس سے روٹھی روٹھی سی تھی۔

وہ اُس کے مہین مرمریں بازو پر پیار کرنے لگا۔

زیبط نے اپنے دوسرے بازو سے وہ بازو بھی ڈھک لیا۔

تبھی— سنگین خان نے اُس کے دونوں بازو اپنی مضبوط گرفت میں لے لئے۔ اور— دیوانہ وار اُسے پیار کرنے لگا۔

اُسکی بے ترتیب ہوئی سانسوں نے، اُسکی مدھر سرگوشیوں نے، اُسکی بولتی آنکھوں نے اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

پھر— سنگین خان ہی حواسوں میں آ گیا۔

''مَیم۔ تمہارا دیا ہوا ٹائم فریم پورا ہوا چاہتا ہے۔'' اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

جبکہ اُسکا دل بالکل نہیں چاہتا تھا۔ کہ وہ جائے۔ مگر— وعدہ، وعدہ تھا۔ نبھانا تو تھا!

وہ بھی سیدھی ہو بیٹھی۔

''چلیں؟''

''آؤ۔'' اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے اُس نے اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے کہا۔

دونوں ایکبار پھر گاڑی میں بیٹھے واپس شہر کی طرف رواں دواں تھے۔

سنگین خان نے ایک نظر زیب پر ڈالی۔
کاسنی کپڑوں پر آف وائیٹ جیکٹ اور آف وائیٹ شوز مین وہ ہمیشہ کی طرح بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اُس پر سنگین خان کی سنگت میں جھکی جھکی آنکھیں، کھلی کھلی رنگت اُسے مزید اڈوریبل بنا رہی تھی۔

اُسے اچانک بابا کا خیال آ گیا۔ وہ اِس شرمائی لجائی بے اندازہ خوبصورت لڑکی کو دیکھیں گے تو کتنے خوش ہوں گے!

''میرے بابا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔'' وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔

وہ خاموشی سے اُسے تکنے لگی۔

''میرے بابا میرے آئیڈیل ہیں۔'' سامنے وائینڈنگ سڑک پر نظریں جماتے ہوئے وہ مزید بولا۔

زیب نے محسوس کیا۔ اُسے اپنے بابا سے بہت عقیدت تھی۔

''ہمیشہ ہشاش بشاش، پُرسکون۔۔۔'' اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

پھر گہری سانس لی۔ پل بھر کو جیسے کچھ سوچا۔

''چاہے کتنے ہی مسائل در پیش ہوں۔'' وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''کبھی حوصلہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ "Baba is wonderful — I really Love him." پھر وہ مسکرایا۔ "He is my best friend".

وہ چپ چاپ اُسے دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی۔

اب وہ آبادی کے قریب آ گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

کچھ دیر دونوں خاموشی سے سامنے تکتے رہے۔

''آپ کے بابا یہاں نہیں آتے؟'' زیب نے رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

''آتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے وہ بھی یہیں سے پڑھے ہیں۔ یہاں گھر بھی اُنہوں نے اپنی خواہش پر لیا ہے۔ بہت پسند ہے اُنہیں برائیٹن، لیکن — بزنس کے کاموں نے کچھ ایسا جکڑ رکھا ہے اُنہیں کہ مشکل سے وقت نکال پاتے ہیں۔ اب میں نے اُن سے کہا ہے کہ میں واپس چلا جاؤں تو وہ آ جائیں یہاں۔'' کچھ تو سکون ملے اُنہیں بھی۔۔۔''

وہ چند لمحے خاموش رہا۔

''تم — تمہارے پیرنٹس بھی تم سے بہت پیار کرتے ہوں گے؟'' اُس نے زیب سے پوچھا۔

''بہت پیار کرتے ہیں۔ لیکن میری بیسٹ فرینڈ۔۔۔ میری امی ہیں''۔

''اوہ'' وہ اتنا ہی بولا۔

وہ چند ثانیے چپ رہا۔ پھر دلنشین آنکھوں میں شوخی اُتر آئی۔

''میری طرح تم بھی اکلوتی تو نہیں ہو''۔

"جی۔ میں بھی اکلوتی ہوں"۔

"پھر تو تم lonely feel کرتی ہوگی"۔

"کبھی کبھی"۔

"اس کا مطلب ہے مجھے جلدی کرنا چاہیے"۔

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ — میرے بابا کو جلدی تمہارے پیرنٹس سے ملنا چاہیے۔ تمہیں میرا بنانے کے لئے"۔

اوہ — تو یہ تمہید اِس لئے باندھی گئی تھی!

سرخ سی ہوتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگی۔

چند موڑ مڑتا اب وہ اپنے علاقے میں داخل ہوگیا تھا۔ دور سے اپنے گھر پر نظر ڈالی۔ پچھلی طرف سمندر کے رخ کھلنے والی اُسکے بیڈروم کی بالکنی، دور تک پھیلا ساحل اور وہیں موورنگ سے بندھی اُس کی بوٹ، سب یہاں سے صاف نظر آرہے تھے۔

اچانک جانے کہاں سے اُسے زیب کا اُس کی موورنگ پر کشتی باندھنا یاد آیا۔ ساتھ میں اُسکا شور اور واویلا بھی۔ سٹیئرنگ وہیل پر سر رکھتے ہوئے وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"کیا ہوا؟" زیب رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تمہیں پتہ ہے۔ تم مجھے کب سے اچھی لگنے لگی ہو؟" وہ اب بھی دلآویزی سے مسکرا رہا تھا۔

"نہیں پتہ"۔

"جس دن سے تم نے میری موورنگ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔"

اور وہ — نادم سی ہوتے ہوئے کانوں تک سرخ ہوگئی۔

"ابھی تم بوٹ میں ہی تھیں۔ کہ تمہارا شور بیڈروم میں میرے کانوں میں پڑا۔ میں بالکنی میں آگیا۔ کہ پتہ نہیں کوئی پانی میں گر گیا ہے؟ ڈوب رہا ہے؟ کیا ہورہا ہے؟ دیکھا تو میم صاحب بوٹ سے اُترتیں میرے گارڈ پر برس رہی تھیں۔

"ہم نے بوٹ تمہاری بوٹ کے اوپر نہیں باندھی۔ خالی موورنگ پر باندھی ہے"۔ وہ اُسی کی طرح تیز لہجے میں بولا۔

وہ بھی ہنس دی۔ خوشگواری سے۔

"ٹھیک تو کہہ رہی تھی میں۔ بوٹ کے اوپر تو بوٹ نہیں باندھی تھی۔ خالی موورنگ پر ہی باندھی تھی۔۔۔"

"وہی خالی موورنگ میری ہے۔ اُس دن میری بوٹ ریپئر کے لئے گئی تھی۔ دوسری تو میرے ایک عرب پڑوسی کی ہے اور اگر وہ خالی ہوتی اور تم — وہاں باندھنے کی کوشش کرتیں تو۔۔۔" اُس نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تو؟ کیا کر لیتا وہ؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"کچھ نہیں۔ بس وہیں لمبا پڑ جاتا۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

"کیا مطلب"؟

"مطلب یہ کہ۔ اوّل تو اُسے اپنے ملک میں کوئی لڑکی بغیر پردے کے نظر نہیں آتی۔ بھوکا ہے بچارا ازل سے۔ اُس پر اتنی خوبصورت لڑکی خود ہی چل کر پاس آجاتی۔ موورنگ تو کیا وہ تو خود کو بھی حوالے کر دیتا۔۔۔"

زیب نے اُسے خشمگین نظروں سے دیکھا۔

"میں اپنی بات نہیں کر رہا۔ اُسکی بات کر رہا ہوں۔" وہ جلدی سے صفائی دینے لگا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اِس سے وہ اُسے بہت اچھا لگا!

"اور میم صاحب۔" اُسے جیسے یاد آیا۔ وہیں سے مجھے اندازہ ہوا تھا۔ کہ تم پاکستانی ہو۔ تمہارے لہجے سے۔ تمہارے لباس سے۔۔۔"

"اور جبھی مجھے پہلی ہی بار 'تم' سے مخاطب کیا تھا۔" اُسے واقعی سٹرائیک ہوا تھا۔

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں تھی۔ بس تم مجھے خود سے بہت چھوٹی لگی تھیں۔ اس لئے۔"

وہ اپنائیت سے اُسے تکنے لگی۔

''اچھا آگے بھی سنو نا''۔

''جی''۔

''جب تم سٹی سینٹر میں ریسٹورانٹ کے آگے شاید اپنی کزن کے ساتھ بیٹھیں کوفی پی رہی تھیں۔ تب بھی مجھے اچھا لگا تھا تمہیں دوبارہ سے دیکھنا اور Royal Pavilion میں جب تمہارے بال میرے بٹن میں اٹکے تھے۔ تب میں نے سوچا تھا۔ تمہارے بال میرے بٹن سے الگ ہی نہ ہوں۔ میں اور تم یوں ہی کھڑے کوششیں کرتے رہیں۔۔۔''

''لیکن۔۔۔ چہرہ تو یوں سپاٹ تھا۔ جیسے کوئی مشین کام میں مصروف ہو۔۔۔''

''اتنی جلدی کچھ کہہ دیتا۔ تو تم مجھے کوئی غنڈہ نہ سمجھتیں۔۔۔''

''آپ۔۔۔ پوری چیز ہیں۔''

اُس کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

''سر!'' وہ دھیرے سے بولی۔

''یس، میم۔''

''آپ میری سٹریٹ سے آگے نکل رہے ہیں۔'' زیب نے اُسے یاد دلایا۔

کہ وہ واقعی آگے نکل رہا تھا۔

''یہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''میرے حواسوں پر ایسی چھا گئی ہو۔ کہ الٹے سیدھے کام کرنے لگا ہوں''۔

''سچ؟'' اُس کی حسین آنکھیں اُس کی آنکھوں میں گڑ گئیں۔

''اِن bewitching نظروں سے دیکھو گی تو خاک ٹھیک کام کروں گا۔''

اور۔۔۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

اُس نے اُس کا خوبصورت چہرہ اپنے قریب کیا۔ اُسے پیار کیا۔ اور—

قدرے پیچھے جاتے ہوئے گاڑی اُس کی سٹریٹ کے اندر موڑ کر بائیں جانب روک لی۔

چند پل وہ اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ اُس نے مان لیا۔ اِن چند دنوں میں ہی وہ اُس کے دل

پر پورے کا پورا قبضہ جما چکی تھی!

ہولے سے مسکراتے ہوئے اُس نے گاڑی کا رُخ موڑا۔ اپنے گھر کی طرف چلا ——

تو سرشار سا تھا، مخمور سا تھا!

شام گہری ہو رہی تھی۔ شفاف آسمان پر تاروں کی بارات، پانیوں کی سرمدی موسیقی، ہوا کے دوش پر دور پار سے آتیں قدیم جزیروں کی خوشبوئیں، سب مل کر اس سے عجیب پراسراری سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

سیاہ کولتار کی سڑک پر چلتا وہ اپنے گھر کے رخ آ رہا تھا۔

پینتالیس منٹ کی رائیڈ پر واقع وہ ضرور کام سے آج لنڈن گیا تھا۔ صبح سے لیکر شام تک مسلسل کام میں مصروف رہا تھا۔ خاصا تھک گیا تھا۔

فرلانگ بھر مزید چلتا، آخری موڑ کاٹتا وہ آہستہ سے اپنی سٹریٹ میں آ گیا۔

پھر—سٹریٹ کے آخر میں اپنے اینکلوژر میں داخل ہوا۔ اور گاڑی گیرج کے اندر لے گیا۔

ندیم گھر کے اندر تھا۔ گاڑی کی لائیٹس دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔

تھکا تھکا یا وہ اوپر اپنے بیڈ روم میں گیا۔ پھر واش روم میں۔

گرم پانی کا شاور لیا۔ تو طبیعت بشاش ہو گئی۔

نرم و گرم casual کپڑے پہنتے ہوئے وہ اپنے لئے کوفی بنانے نیچے کچن میں آ ہی رہا تھا۔ کہ کوفی کا کپ لئے ندیم سامنے آ گیا۔

''کوفی سَر۔'' وہ مؤدب طریق سے بولا۔

''میں آ رہا تھا بنانے۔'' اُس نے ممنون لہجے میں کہا۔

''مجھے معلوم ہے سَر آپ صرف اپنے ہاتھ کی کوفی پیتے ہیں۔ مگر اِسوقت آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ اِس لئے میں نے بنا دی۔''

''سو نائیس آف یُو ندیم۔'' اُس نے کپ اُس سے لے لیا۔ اور—

حسبِ معمول اپنی بالکنی میں آتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

یہاں سے اُسے سبھی کچھ تو نظر آتا تھا۔ دائیں جانب تا حدِ نظر ساحل اور سمندر، سامنے اور بائیں طرف اپنے تینوں دوستوں کے سلیٹی ڈھلانی چھتوں اور فل لینتھ شیشوں کے خوبصورت گھر۔

حسبِ معمول اس وقت ساحل سنسان تھا۔ تیز ہوا یخ بستہ اور—پانیوں پر چلتی تنہا بارج نے اپنی بتی روشن کر لی تھی!

کوفی کی سحر انگیز خوشبو من میں اتارتا، گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا وہ بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔

معاً —سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اور پھر—

اُس کے بیڈ روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک۔

''یس۔'' وہ وہیں سے بولا۔

اور—ندیم کی ہمراہی میں آئی نائلہ بالکنی کے دروازے میں آ نمودار ہوئی۔ نائلہ نے ہی ندیم کو واپس جانے کو کہا۔

''تم؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''کیوں؟'' میں نہیں آ سکتی؟'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

وہ خاموش رہا۔ گو اُس نے یا بابا نے اُن دونوں کو منگنی توڑنے کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔ مگر اُس کی طویل خاموشی اور پھر کچھ عرصے سے یہاں چپ چاپ قیام اُس کے خیال میں کافی تھا۔ نائلہ کو منگنی میں اُسکی عدم دلچسپی کا پیغام دینے کو!

لیکن — وہ تو یوں چلی آئی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا!

''بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟'' وہ سراپا ناز و ادا تھی۔

''اَ۔ ہاں۔ آؤ بیٹھو۔'' اور وہ کہتا بھی کیا؟

وہ اُس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ یقیناً لنڈن اپنے گھر آئی تھی۔ اور پھر وہاں سے یہاں۔

''کیا پیئو گی؟ کوفی؟ چائے؟'' اُس نے اپنا کپ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ بھی۔'' اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

وہ اُٹھا۔ نیچے کچن میں گیا۔ اور اُس کے لئے کوفی بنانے لگا۔

آج وہ اُس covered ڈریس میں نہیں تھی۔ جس میں وہ اُس کے گھر میں رہتی تھی۔ کیپری پینٹس اور بہت گہرے گلے والی شرٹ پہنے تھی۔ خیر —

یہ تو جگہ بھی ایسی تھی۔ پر —

یکدم اُسے خیال آیا۔ زیب تو یہاں بھی پوری کورڈ رہتی تھی۔ پھر —

ایک مدھر مسکراہٹ اُس کے لبوں پر چھا گئی۔ دونوں میں ہی وہ کتنا چاہنے لگا تھا اُسے!

کوفی کا کپ اُسے تھماتے ہوئے وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''تم — لنڈن سے آرہی ہو؟''

''ہاں۔ مگر لنڈن میں اکیلی آئی ہوں۔ مام وہیں ہیں پاکستان میں۔''

''اچھا۔ کوئی خاص کام تھا کیا؟''

''آپ بنتے کیوں ہیں اتنا۔ اتنی دور میں اور کس لئے آسکتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی میں اپنے منگیتر کے پاس آئی ہوں۔ That's it."

''اوہ۔''

تو سلسلہ ابھی چل رہا تھا! وہ بھی کتنا بیوقوف تھا۔ صرف بابا کے سامنے انکار کرنے سے بات سچ مچ تو ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ بہرحال —

''اچھا مما کیسی ہیں؟ باقی سب لوگ؟''

''آپکی مما بھی ٹھیک ہیں۔ اور باقی سب لوگ بھی ٹھیک ہیں۔ مگر میں ٹھیک نہیں تھی۔ یاد آرہے تھے آپ مجھے بہت۔ پھر یہاں آکر تو آپ نے بالکل ہی چپ سادھ لی تھی۔ مجھ سے اور رہا نہیں گیا۔ سو چلی آئی۔۔۔''

پتہ نہیں کیوں؟ اُسکی باتوں سے صاف پتہ چل رہا تھا۔ کہ وہ تصنع سے کام لے رہی تھی۔ اُسکا لب ولہجہ اُسکی باتوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

نائلہ برائیٹن پہلی بار آئی تھی۔ گو سنگین خان بے حد تھکا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی — وہ اُسکی مہمان تھی۔ وہ اُسے دور خاصے فاصلے پر اپنے ایک پسندیدہ ریسٹورانٹ میں لے گیا۔ اُسے مزیدار ڈنر کھلایا۔ اور واپس گھر آنے لگا۔

وہ حیران سا تھا۔ کہ کیا وہ رات کو لنڈن اپنے گھر واپس جائے گی؟ جب کہ خاصی دیر بھی ہوچکی تھی۔ وہ ٹرین سے آئی تھی۔ کیا واپس بھی ٹرین سے ہی جائے گی؟ ایسا ہوا۔ تو وہ اُسے خود چھوڑ آئے گا۔ رات کو اکیلے میں ندیم کے ساتھ بھی نہیں۔ کہ وہ بہرحال اُسکی مما کی بھانجی تھی!

خیر — اُسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ شاید وہ یہ سمجھ لیتی کہ وہ اُسے چلتا کرنے کی سوچ رہا تھا۔

بہرحال — وہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ کسی اچھے سے ہوٹیل میں اُسکے قیام کا بندوبست کردے گا۔ اُس نے سوچا۔ اور مطمئن ہوگیا۔

رات خاصی ہوچکی تھی۔ اس نے انٹرکوم پر ندیم سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ اور — دونوں گھر کے اندر آگئے۔ وہیں لِونگ روم میں بیٹھ گئے۔

''آج بہت تھک گئی ہوں میں۔'' وہ اپنا ہینڈ بیگ اپنے قریب صوفے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"میں خود بہت تھکا ہوا ہوں۔ آج میں بھی لنڈن گیا تھا۔ سارا دن کام کرتا رہا ہوں بالکل exhaust ہوا ہوا ہوں اِس وقت۔" اُس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنی دلنشیں آنکھیں موند لیں۔

نائلہ اُس کے پُرکشش سراپے کو دیکھتی رہی۔ لمبا قد، چوڑے شانے، دلکش نقوش— مردانہ وجاہت کا مکمل شاہکار!

وہ ہنوز آنکھیں موندے نائلہ کے رات بسر کرنے کے کسی فیصلے کا منتظر رہا۔ مگر—

وہ تو اُس کے ہی سراپے میں کھوئی ہوئی تھی۔ عجیب للچائی سی نظریں تھیں۔ بھوکی سی!

"نائلہ۔ چلو تمہیں ہوٹیل لے چلوں۔ رات بھی کافی ہوگئی ہے اور— مجھے نیند بھی آرہی ہے۔ صبح اٹھو تو مجھے کال کرلو۔ میں لینے آجاؤں گا۔ ناشتہ یہیں کرنا میرے ساتھ۔۔۔"

"کیا؟ آپکا گھر ہوتے ہوئے میں رات ہوٹیل میں گزاروں گی؟" وہ بے انتہا حیرانگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ اُس سے بھی زیادہ حیران ہوگیا۔ "تم رات میرے گھر میں گزاروگی؟"

اُسکا بے باک قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاں۔ میں رات اِدھر ہی رہوں گی۔ آپ میرے منگیتر ہیں۔ میرا جائز حق ہے اِدھر رہنے کا۔ میں۔۔۔"

"ویٹ۔ ویٹ۔ جائز حق نکاح کے بعد ہوتا ہے۔ منگنی کے بعد نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کہیں۔۔۔ آپکو مجھ سے ڈر تو نہیں لگ رہا۔" اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"فضول باتیں مت کرو۔ اٹھو اور چلو۔۔۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں ڈارلنگ۔ میں نہیں جاؤں گی۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ سوؤں گی جاکر۔" اُس نے اُسے ایک kiss دیا۔ 'گڈ نائیٹ' کہا اور—

آرام سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر سنگین خان کے پاس والے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ جہاں اُس کا بیگ رکھا گیا تھا۔

کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ جہاں اُس کا بیگ رکھا گیا تھا۔

چند پل وہ پریشان سا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر—

بوجھل سے قدم اٹھاتا وہ بھی اوپر اپنے بیڈروم میں آگیا۔

کپڑے تبدیل کئے۔ نائیٹ سوٹ پہنا۔ اور—

بستر میں گھس گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی۔ جلدی ہی نیند نے آلیا۔

صبح کے تین بج رہے تھے۔ کل سے ہی سنگین خان کا گلا خراب تھا۔ اِس وقت اچھی خاصی کھانسی ہو رہی تھی۔ اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولتے ہوئے strepsils نکال لیں۔ ایک گولی منہ میں ڈالی اور باقی واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھ ہی رہا تھا۔ کہ—

کسی نے آہستہ سے اُسکے بیڈروم کا دروازہ کھول لیا۔

اُس نے لیمپ آن کیا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ تقریباً ننگے نائیٹ سوٹ میں ملبوس نائلہ اندر آرہی تھی۔

"تم؟" سیدھا ہوتے ہوئے بستر کی پشت سے ٹِک کر وہ حیرت سے بولا۔

نائلہ کچھ بھی بولے بنا آگے بڑھتے ہوئے اُس کے بستر میں گھس کر اُس سے لپٹ گئی۔

"مجھے نیند نہیں آرہی سنگین۔" وہ اُس کے اَدھ کھلے شرٹ میں سے اُس کے چوڑے سینے میں گھسی جارہی تھی۔ ہاتھ برابر اُس کے کسرتی مضبوط جسم کا جائزہ لے رہے تھے۔ "تمہارے جسم نے مجھے پاگل کیا ہوا ہے۔ تمہارا لمس مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔ میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اِس آگ کو۔۔۔ اِس آگ کو۔۔۔" وہ اُسے چومتی جارہی تھی۔ اور کہتی جارہی تھی۔

سنگین خان کو اُس سے سخت کراہت محسوس ہوئی۔ ایک لڑکی اتنی بھی گر سکتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا!

اُسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے وہ بستر سے باہر نکل آیا۔

واش روم گیا۔ ہاتھ منہ دھوئے، کپڑے تبدیل کئے۔ باہر نکلا۔

وہ اب بھی روتی سسکتی اُس کے بستر پر پڑی تھی۔

کوئی توجہ دیئے بِنا وہ سیڑھیاں اُترتا نیچے آ گیا۔

لِونگ روم کے پردے کھولے۔ کھڑکی کے اُس پار کُہر ہی کُہر تھی۔ ساحل نظروں سے اوجھل ہورہا تھا۔ سمندر میں البتہ کُہر کے پردوں کو چیرتی کسی بوٹ کی روشنی سمتوں کا پتہ دے رہی تھی۔

ذہن پر بوجھ سا لئے چند ثانیے وہ وہیں کھڑا اِس پار جھانکنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ پھر ——

سامنے کلاک پر نگاہ کی۔ چار بج چکے تھے۔ روزانہ اِس وقت زیب اُسے جگانے کو کال کرتی تھی۔ اُسے 'گڈ مورننگ' کہتی تھی۔ اور نماز پڑھنے کا کہہ کر فون بند کر دیتی تھی۔

لیکن —— اُس کا سیل فون تو اوپر تھا۔ اُس کے بیڈروم میں۔

کہیں نائلہ نے اُس کی کال ریسیو تو نہیں کر لی ہوگی؟

کرتی ہے تو کرے۔ اُسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔

تیز تیز قدم اُٹھاتا وہ دوبارہ اوپر گیا۔ بیڈروم کا دروازہ کھولا۔

نائلہ نہیں تھی اُس کے بیڈ میں۔ جا چکی تھی شاید اپنے کمرے میں۔ اُس نے نجات کی سانس لی۔

اپنا سیل چیک کیا۔ زیب نے عین چار بجے اُسے کال کی تھی!

وہ ہڑبڑا سا گیا۔ اِس بات پر نہیں کہ —— نائلہ کو زیب کے بارے میں پتہ چل گیا ہوگا۔

بلکہ —— اِس بات پر کہ زیب کو نائلہ کا پتہ نہ چل گیا ہو!

وہ تو ویسے بھی اِس معاملے میں بہت حساس تھی۔ نہ خود کسی مرد سے تعلق رکھا تھا۔ نہ اُس سے کسی اور لڑکی کی توقع کرتی تھی۔

بہر حال —— اُس نے نماز پڑھی۔ وہ نماز کا کبھی پابند نہیں رہا تھا۔ یہ کریڈٹ زیب کو جاتا تھا!

پھر —— وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ایک نظر نائلہ کے کمرے پر ڈالی۔ دروازہ بند تھا۔ شاید سو گئی تھی۔

وہ نیچے کچن میں آ گیا۔ اپنے لئے کوفی بنائی۔ اور اوپر بالکنی میں آ بیٹھا۔

صبح کی پَو پھٹنے کو تھی۔ چہار سُو اب بھی کُہر کا راج تھا۔ سمندر کی نیلگوں پاپیناں اب بھی نظروں سے اوجھل ہورہی تھیں۔ اُن سب کے گھر بھی دھندلے دھندلے سے تھے۔

تیز ہوا نشتر کا کام کر رہی تھی۔ اُس نے جیکٹ کا کالر اوپر چڑھایا۔ گرم سٹرونگ بلیک کوفی کا گھونٹ بھرا۔

بے تحاشہ سردی، کہر اور —— روسٹڈ کرشڈ بینز کی کوفی!

وہ سرشار سا ہو گیا!

لیکن —— جلدی ہی اُسے پھر سے نائلہ کا اُس کے کمرے میں گھسنا یاد آیا۔ بھولا ہی کب تھا وہ؟ یہ تو غالباً جنت نظیر موسم اور ہاٹ سٹرونگ کوفی کا اثر تھا۔ کہ پل بھر کو وہ ذہن سے اُتر گئی تھی۔

تبھی —— اُسے زیب کا خیال آ گیا۔

کتنا فرق تھا دونوں لڑکیوں میں۔ وہ تو صرف اُس کا اُسکی آنکھوں میں جھانکنے سے ہی گھبرا جاتی تھی۔ چہرہ سرخ اور پلکیں گرنے اٹھنے لگی تھیں۔ لیکن ——

یہ کس مٹی کی بنی تھی؟ فرض کیا وہ بھی بہک جاتا۔ عقل ساتھ چھوڑ دیتی۔ تو وہ تو کہیں کی نہ رہتی۔ لڑکی ذات تھی۔ کچھ تو عقل سے کام لینا چاہیے تھا اُسے۔

پھر یکدم ہی اُسے خیال آیا۔ وہ پاکستان میں بھی تو اُس لڑکے کے ساتھ رات کو ہی اور ننگے ہی لباس میں گھومنے نکلی تھی۔

کیا اُس کا اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی relation تھا؟

گوڈ! وہ جیسے سکتے میں آ گیا۔

نائلہ اُس لڑکے کے علاوہ سنگین خان کے ساتھ بھی اکیلی، رات کے اندھیرے میں بہت بے تکلفی سے گھوم پھر رہی تھی۔ اُس کی بھی آنکھوں میں بے باکی سے دیکھتی تھی۔ رات لِونگ میں موندی ہوئی آنکھوں سے بھی اُس نے محسوس کیا تھا۔ وہ اُسے سرتاپا عجیب ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اپنی ہوس کی بھوک مٹانے رات کے اندھیرے میں تقریباً ننگی اُس کے بیڈروم میں آ کر اُس سے آ لپٹی تھی۔ پھر ——

وہ مزید چونکا۔ وہ جو حرکتیں کر رہی تھی وہ کسی اناڑی لڑکی کی حرکتیں نہیں تھیں۔ خاصی مہارت تھی اُس کے ہاتھوں کی ہر جنبش میں، اُس کے تپتے ہونٹوں کی ہر لرزش میں، اُسکی بے باک آنکھوں کی ہر نظر میں!

کہر دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔ دھند کا اب بھی ہر سُو راج تھا۔ سورج دیوتا البتہ دھندلی دھندلی کرنیں بکھیر رہا تھا۔

اُس نے خالی کپ اٹھایا۔ اور اپنے بیڈ روم میں سے ہوتا نیچے آ گیا۔ کپ کچن میں رکھا۔ اور لِونگ میں آ کر ہلکے والیوم میں ٹی وی آن کر لیا۔ کیونکہ اوپر نائلہ اور نیچے اپنے بیڈ روم میں ندیم سو رہا تھا۔

وہ کل کا تھکا ہوا تھا۔ رات کو بھی قریباً جاگتا رہا تھا۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اُس نے تھکی تھکی آنکھیں موندلیں۔

اُسے کوئی پتہ نہیں چلا کب ندیم جاگا؟ اور کب اُس کا ناشتہ تیار کر کے میز پر لگایا؟

''سَر۔ ناشتہ لگا دیا ہے۔'' ندیم نے مؤدب طریق سے اطلاع دی تو ——

وہ چونکا۔ شاید غنودگی نے آ لیا تھا اُسے۔

بہرحال —— وہ کونے میں لگی ٹیبل پر گیا۔ اور ——

ناشتہ کرتے کرتے ایکبار پھر نظریں ٹی وی پر جما دیں۔

ساتھ ہی —— سیل پر زیب کا نمبر بھی ملا لیا۔

کسی طور ریسیو نہیں کر رہی تھی اُس کی کال۔ یقیناً نائلہ کی آواز سن لی تھی۔ وہ بھی اتنی صبح صبح اُسی کے سیل پر۔ پتہ نہیں کیا کیا سوچا ہوگا اُس کے بارے میں؟

وہ اُسے منالے گا اُس نے سوچا۔ یہ الگ بات تھی کہ اُسے convince کرنا خاصا مشکل ہوگا!

لیکن —— آج تو وہ اُسے منا بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ ——

آج اُس نے نائلہ کو برائیٹن میں گھمانا پھرانا تھا۔ اور نائلہ کی فرمائش پر اُسے شوپنگ بھی کرانی تھی۔

بُری طرح پھنس گیا تھا وہ!

گیارہ بجے نائلہ نے ناشتہ کیا۔ تیار ہوئی۔

لگتا ہی نہیں تھا۔ کہ رات اُس کے اور سنگین خان کے بیچ کوئی تلخی بھی ہوئی تھی!

وہ اُسے سٹی سینٹر میں 'The Lanes' لے گیا۔ وہی بے شمار چھوٹی چھوٹی وائینڈنگ سٹریٹس، وہی اَن گنت سٹالکش دکانیں، وہی بافراط سامان۔ اور —— جگہ جگہ پیومنٹ کیفیز۔

پھر —— جیب سنگین خان کی اور پسند نائلہ کی تھی۔ اُس نے لاکھوں کی شوپنگ کر لی۔ یوں ہر چیز سمیٹ رہی تھی۔ جیسے آئندہ کبھی موقعہ ہی نہیں ملے گا شوپنگ کرنے کا۔

اُسکی آنکھوں میں حرص کی چمک اور بے تحاشہ خریداری کی لالچ دیکھکر سنگین خان پریشان سا ہو گیا۔ کوئی بھی تو اچھی عادت نہیں تھی اُس میں۔

اُسی کی ہی خواہش پر وہ وہیں اُس کے ساتھ روڈ سائیڈ پر ایک پیومنٹ کیفے میں بیٹھ گیا۔

دونوں نے کوفی آرڈر کی۔ اور —— پینے لگے۔

ویک اینڈ تھا۔ بے شمار لوگ جگمگ جگمگ کرتی اَن گنت دکانوں سے اَٹی اِن چھوٹی چھوٹی سٹریٹس میں گھوم پھر رہے تھے۔

وہ میز کے نیچے ٹانگیں سیدھی پھیلائے، کوفی پیتے، ریلیکس کر رہا تھا۔

تبھی اُسے —— نزدیک تر آتی زیب دکھائی دی۔ اُسکا کزن بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اور اُسکی خالہ بھی۔

زیب پاس سے گزرتی اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔ جوں ہی اُس کی نظروں سے نظریں ملیں۔ رخ دوسری طرف کر لیا۔ ایک ہی نظر میں اُس نے دیکھ لیا۔ وہ بہت خفا تھی، بہت غصہ بھی!

وہ —— واقعی پھنس گیا تھا۔ بری طرح!

صبح یقیناً اُسکی کال نائلہ نے ریسیو کی تھی۔ اور اس وقت وہ اُسی کے ساتھ بیٹھا کوفی پی رہا تھا!

''ایک بات پوچھوں؟'' نائلہ بولی۔

''ہاں۔''

''یہ۔۔۔ زیب کون ہے؟''

وہ مسکرا دیا۔ دلآویزی سے۔

''ہے ایک لڑکی۔''

اُسکے مسکراہٹ کی دلآویزی اُسے زہر لگی۔

''وہ تو مجھے بھی پتہ ہے ایک لڑکی ہی ہے۔ جبھی تو میری آواز سن کر پہلے کچھ حیران ہوئی۔ اور پھر کچھ بولے بنا ہی فون بند کر دیا۔''

''وہ مجھے صبح صبح گریٹ کرنے کو فون کرتی ہے۔ نماز پڑھنے کا بھی کہتی ہے۔'' وہ بات چبا چبا کر بولا۔

"Oh really?" وہ گہرے طنز سے بولی۔

''ہاں۔'' اُس نے دلنشین آنکھوں کی جنبش سے 'ہاں' کہا۔

''پاکستانی ہے؟''

''ہاں — ابھی گزری تھی اِدھر سے۔'' وہ جیسے خاص طور سے اُسے سنانے کو بولا۔

''ابھی ابھی۔۔۔ جس کے ساتھ ایک پکی عمر کی عورت تھی۔ ایک لڑکا بھی تھا۔۔۔''

یہ اُس نے خاص طور سے نوٹ کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ زیب کی بے پناہ خوبصورتی اُسے سٹرائیک کر گئی تھی۔ دوسرا یہ کہ — بالکل پاس سے گزرتی وہ سنگین خان کو بغور تکتی رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اُس کی یہی سمجھ میں آسکی تھی۔ کہ سنگین خان بہت ہینڈسم تھا۔ اور کوئی بھی لڑکی اُسے دیکھنے پر مائل ہو سکتی تھی۔

''ہاں۔'' اُسکی 'ہاں' میں اُسکے لئے اپنائیت تھی۔

وہ جل بھن کر رہ گئی۔

''ہے کون؟''

''میری گرل فرینڈ۔'' اُس نے آرام سے کہا۔

''منگنی ہو جانے کے بعد تم کوئی گرل فرینڈ نہیں بنا سکتے۔'' وہ رات سے ہی اُسے 'تم' کہنے لگی تھی۔ اِس وقت تیز بھی ہونے لگی۔

''اچھا؟''

''ہاں۔ اور تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آنیوالی عید پر ہم دونوں کی شادی ہونیوالی ہے۔''

وہ چند پل آتے جاتے لوگوں پر نظریں جمائے رہا۔

''کیا — بابا نے تم لوگوں کو بتایا ہے۔ کہ میں یہ منگنی ختم کر چکا ہوں۔'' اُس نے کہنا ضروری سمجھا۔ کیونکہ اُسے اندھیرے میں رکھنا بھی مناسب نہیں تھا۔

''ہاں بتایا ہے لیکن میں اسے ختم نہیں سمجھتی۔''

اتنی بڑی آسامی کو اور — پھر اتنی ہینڈسم چیز کو وہ اتنی آسانی سے ہاتھ سے کیسے جانے دیتی؟

''کیوں؟''

"Cause I love you." آخر پچھلے کئی مہینوں سے تم ہی میرے دل و دماغ میں بس رہے ہو۔۔۔''

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

"This is not love." وہ بہت سکون سے بولا۔ ''اور نا ہی میں تمہارے دل و دماغ میں بس سکتا ہوں۔''

''کیوں؟'' کیوں نہیں بس سکتے؟''

''کیونکہ میں تمہارے ٹائیپ کا نہیں ہوں۔ تمہارا ٹائیپ کچھ اور ہے۔۔۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً —'' اُس نے خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔ ''شاید۔۔۔ وہی لڑکا جس کے ساتھ تم چند مہینے پہلے پاکستان میں میریٹ میں ڈنر پر گئی تھی۔۔۔'' وہ بہت ٹھنڈے دل سے کہہ رہا تھا۔ بہت دھیرج سے۔ کہ —

اُسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کہ وہ کیا کرتی تھی۔ اور کیا نہیں کرتی تھی۔

پہلے تو وہ گڑبڑائی۔ پھر فوراً خود کو سنبھالا۔

''اوہ۔ تم شاید جونی کی بات کر رہے ہو۔ "He is just a boy friend." وہ تو میرے ساتھ لنڈن بھی آیا ہوا ہے۔۔۔''

اپنی روانی میں وہ کہہ تو گئی۔ مگر پھر — جیسے اپنے آپ میں آ گئی۔ سنگین خان اور اُسکے خاندان کے طور طریقے مختلف تھے۔ وہ جس بات کو آج کا فیشن سمجھ رہی تھی وہ اُن کے خاندان

میں معیوب سمجھا جاتا تھا!

''سوری۔ پتہ نہیں میں بھی کیا کیا کہہ جاتی ہوں۔۔۔''

"No please! I don't mind it. One should be brave enough to tell the truth. I appreciate it..."

وہ مزید ہوش میں آ گئی۔

"Why should you appreciate it? Why shouldn't you mind it?"

اُس نے ایک گہری، مگر مطمئن سانس لی۔

"Should I tell you something? If this very word was told by Zeb to me. I would have killed her."

"Oh wow." اُس نے بڑے ضبط سے کہا۔ مگر—

زیب کے لئے اُس کی اِس قدر Possessiveness دیکھکر اُس کے دل میں زیب کے لئے آگ سی بھڑک اُٹھی۔

''اب چلیں؟'' سنگین خان نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

سنگین خان نے اُسکی بھاری بھرکم شوپنگ اٹھائی۔ اور دونوں سٹریٹس سے باہر نکلتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے۔

وہ سڑک پر نظریں جمائے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''کچھ چپ چپ ہو۔ کیا بات ہے؟'' سنگین خان نے خاموشی توڑی۔

''کچھ نہیں۔''

وہ سمجھ رہا تھا۔ اُسے زیب کا ذکر اچھا نہیں لگا تھا۔ پھر بھی—

''کچھ تو ہے۔'' وہ ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ کہ—

وہ اُسکی مہمان بھی تو تھی!

''تمہیں کیا۔ مجھے کچھ بھی ہو۔'' وہ روٹھی روٹھی سی بولی۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔''

''مجھے قدر کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''میں تو کروں گا۔ تم میری مما کی بھانجی ہو۔ اتنی دور سے مجھے ملنے آئی ہو۔۔۔''

''بس کرو۔ مجھے قدر نہیں چاہیے۔''

''پھر کیا چاہیے؟''

"I want you. I need your love. I don't want qadar..."

''قدر بہت اچھی چیز ہے۔'' اُس نے اُسے چھیڑا۔

''میں تمہاری نانی اماں ہوں۔ کہ تم میری قدر کرتے ہو۔۔۔''

اُس کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''پھر بھی— قدر کرنا اچھی بات ہے۔''

اور — آگ بگولہ ہوتے ہوئے اُس نے رخ باہر کی طرف کر لیا۔

شام چار بجے نائلہ اور سنگین خان کو ڈاکٹر ضیاء نے اپنے یہاں چائے پر بلایا تھا۔ یوں تو آج صبح بھی اپنے احاطے میں ہی سنگین خان نے ضیاء کے ساتھ نائلہ کا اپنی کزن کے طور پر تعارف کروایا تھا۔ مگر اِس وقت نائلہ نے باقاعدہ اُسکی منگیتر کی حیثیت سے خود کو متعارف کروایا۔

''اوہ گوڈ! تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔'' وہ حیرت سے گویا ہوا۔

سنگین خان نے جز بز سا ہوتے ہوئے اپنی چائے کا کپ اُٹھا لیا۔

''میری منگنی ہوئی۔ تو میں بھی تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔'' وہ دوبارہ بولا۔

''ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' نائلہ اِٹھلاتے ہوئے بولی۔

''بھابھی میں اِس کو چھوٹی سی بات بتا دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ۔۔۔ آجکل ایک پاکستانی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اگر چہ یکطرفہ ہے اب تک۔ لیکن پھر بھی اِس گھنے کو بتا دیا ہے۔ اور یہ ہے کہ۔۔۔'' وہ باقاعدہ ناراضگی سے کہہ رہا تھا۔

نائلہ کا کھنکتا قہقہہ بلند ہوا۔

"ٹھیک تو کہہ رہے ہیں ضیاء صاحب۔ سنگین تمہیں بتا دینا چاہیے تھا کہ ہم دونوں کی منگنی ہوچکی ہے۔ آخر تو ضیاء صاحب تمہارے کلوز فرینڈ ہیں۔۔۔"

نائلہ جانتی تھی سنگین خان کو اِس ذکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر ضیاء کے سامنے خاموش تھا۔ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ منگنی کے ذکر طول دے رہی تھی۔

"تم دونوں چائے پیئو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" سنگین خان نے اُن کی توجہ چائے کی طرف دلائی۔

دونوں نے ہی اپنا اپنا کپ اٹھالیا۔

"ہائے داوے ڈاکٹر صاحب۔ یک طرفہ عشق سے آپکا کیا مطلب ہے؟" نائلہ یوں بول رہی تھی۔ جیسے عرصے کی جان پہچان تھی اُس سے۔

وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔

"دراصل۔۔۔ وہ لڑکی ذرا زیادہ ہی مشرقی ہے۔ یا پھر۔۔۔ بے انتہا خوبصورت ہے۔ شاید اِس لئے لفٹ نہیں دے رہی۔۔۔"

سنگین خان بےکل سا ہوگیا۔ وہ یقیناً زیب کی بات کر رہا تھا!

"جلدی جلدی چائے ختم کرو۔ بوٹ پر چکر بھی لگانا ہے۔ اور رات کو تم آن کال بھی ہو۔ عشق وِشق چھوڑو۔ اپنے پروفیشن پر توجہ دو۔"

ڈاکٹر ضیاء سرجن تھا۔ رات کو اُسکی ڈیوٹی تھی ہوسپٹل میں۔

"یار تم تو بات ہی نہیں کرنے دے رہے۔ مجھے پتہ ہے آج میں آن کال ہوں۔ بات کرنے دو مجھے بھابھی سے۔۔۔"

"بالکل نہیں۔ چائے ختم کرو۔ بوٹ میں جائیں گے۔ تو جی بھر کے باتیں کر لینا۔ اندھیرا ہوگیا۔ تو سمندر پر کوئی مزا نہیں آئے گا۔"

"یہ تو ہے۔ پہلے ہی کہہ دیتے۔" اُس نے توجہ چائے پر مرکز کرلی۔

اِس کے باوجود باتیں ہوتی رہیں۔ نائلہ ڈاکٹر کو یہاں دیکھی جگہوں سے متعلق بتانے لگی۔ اِدھر کی اُدھر کی۔

اب سنگین خان خاموشی سے سن رہا تھا سب۔

"دیکھا ابھی۔ کیسا چپ چاپ بیٹھا ہے۔ اب کوئی جلدی نہیں۔ دراصل اِسے میرے عشق سے بَیر ہے۔۔۔"

نائلہ کا ایک اور نقرئی قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" اُس نے کہا۔

چائے پی چکے۔ تو تینوں گھر سے باہر نکل آئے۔

پھر— سنگین خان کے ساتھ ڈھلان اُترتے ہوئے وسیع ساحل پر اور— وہیں قریب بندھی اُسکی بوٹ پر آگئے۔

شام متوالی تھی۔ ہوا اِٹھلاتی۔ اور— نیلم سا پانی مترنم!

"تم دونوں بیٹھو۔ میں بوٹ چلاتا ہوں۔" ڈاکٹر ضیاء نے دونوں کو اکٹھے رہنے کا موقع دینا چاہا۔

سنگین خان نائلہ کو لیکر luxurious بوٹ کے اندر سے ہوتا دو چار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر ڈیک پر آ گیا۔

دونوں خوبصورت چیئرز پر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر نے بوٹ سٹارٹ کردی۔

جانے کہاں سے؟ اَچانک ہی نائلہ کی صبح 'The Lanes' میں پیومنٹ کیفے والی ناراضگی واپس لوٹ آئی۔ سنگین خان کا زیب کا اپنائیت سے ذکر کرنا۔ نائلہ سے منگنی ٹوٹنے کا اعادہ کرنا۔ واپسی پر جب اُس نے سنگین خان سے کہا تھا کہ She wants him, she needs his love. تو اُس نے کہا تھا۔ کہ وہ اُسکی قدر کرتا تھا۔ اِس کا مطلب تھا۔ محبت نہیں کرتا تھا!

سنگین خان روتی بسورتی نائلہ کو سمندر کنارے واقع مختلف جگہوں کے بارے میں انفارمیشن فراہم کر رہا تھا۔

"وہ— دیکھو۔ لائیٹ ہاؤس ہے۔" اُس نے دور سمندر کنارے نصب قدیم لائیٹ ہاؤس کی طرف اِشارہ کیا۔ "مگر اب یہ استعمال میں نہیں ہے۔ ہاں محفوظ ضرور کر رکھا ہے اتھارٹیز

نے ۔۔۔''

مگر— نائلہ اُس طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

وہ عجیب مخمصے میں تھا۔ وہ جو چاہتی تھی۔ وہ اُسے نہیں دے سکتا تھا۔ بقول اُس کے— پیار ۔ پھر دوسری طرف وہ اُسکی کزن بھی لگتی تھی۔ اُسکی گیسٹ بھی!

وہ اُسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسکی خواہش تھی کہ وہ اُس کے پاس سے خوشی خوشی رخصت ہو۔ مگر—

نائلہ کچھ اور ہی سوچ کر آئی تھی۔ وہ ہر حال میں اُسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک بزنس ٹائیکون تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ اکلوتا تھا۔ انڈسٹری، Real Estate، بزنس— ہر چیز کا وہ واحد ہی تو وارث تھا!

پر— کسی طرح اُس کے ہاتھ آ ہی نہیں رہا تھا۔ اور اِس سب کی وجہ وہ زیب کو گردانے لگی تھی۔ اُس کا خیال تھا یہاں آ کر وہ بدل گیا تھا۔ پاکستان تک وہ ٹھیک تھا۔ کبھی کبھار سہی اُس سے فون پر رابطہ کر لیتا تھا۔ اُس کے ساتھ ساتھ سب کی خیر خیریت دریافت کر لیتا تھا۔ اُسے کبھی باہر ڈیٹ پر لیکر نہیں گیا تھا تو یہ اُس کے خیال میں اُسکی اور اُسکے خاندان کی دقیانوسیت کی وجہ تھی۔ اور کچھ نہیں۔

جبکہ—

ایسا نہیں تھا۔ سنگین خان کی منگنی کسی محبت وغیرہ کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ مما کے کہنے پر بابا کی خواہش تھی۔ جسے وہ کسی طور رد نہیں کر سکتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ بابا کی خوشیاں لوٹانے کی خاطر سب مان گیا تھا۔ پھر نائلہ بھی تو مکمل مشرقیت کا روپ دھارے تھی۔ مشرق اور مشرقیت اُسکی کمزوری تھی۔ بابا کی بھی۔

سو— منگنی طے پا گئی۔

وہ نبھا رہا تھا۔ شادی کے لئے تیار تھا۔ کہ—

اُس نے نائلہ کو اُس لڑکے کے ساتھ رات کو میریٹ میں ڈنر پر اُس کے اصلی روپ میں دیکھ لیا۔ اور تب ہی اُس سے شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔

اُس کے بعد بھی وہ تھوڑا عرصہ وہاں رہا تھا۔ لیکن کام کا پریشر اور پھر گرمی کا زور۔ بابا نے

اُس سے کہا۔ کہ وہ چند ہفتے برائیٹن میں گزار لے۔ سو— وہ چلا آیا۔

جلدی ہی اُسکی مڈبھیڑ زیب کے ساتھ ہوگئی۔ اور پہلی ہی نظر میں وہ اُسکی محبت میں گرفتار ہوگیا۔

اب بھی لائیٹ ہاؤس پر نظریں جمائے وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

آج صبح سے اُس سے کوئی کونٹیکٹ نہیں ہو پایا تھا۔ کوشش تو کی تھی۔ مگر صبح ہی صبح اُس نے جو نائلہ کی آواز سنی۔ ایسی خاموشی اختیار کر لی۔ سیل فون ایسا بند کیا۔ کہ کوئی کونٹیکٹ ہونے ہی نہیں دیا۔

باپ رے۔ 'The Lanes' میں پیومنٹ کیفے میں جو نظر سنگین خان پر ڈالی تھی۔ بہت خطرناک تھی!

اور— ایکبار پھر— وہ چونکا۔

زیب اور اُسکا کزن بمعہ اُسکی خالہ کے بوٹ میں بیٹھے اُن کے پاس سے گزر رہے تھے!

اُسکی بہت— بہت شامت آئی تھی!

وہ تو اُس کی صرف منگنی کا ذکر ہی سن کر faint ہونے کو تھی۔ کہاں کہ منگیتر کو اُس کے ساتھ دیکھ لیتی۔ وہ بھی جبکہ اُسے یہ بتایا گیا تھا کہ منگنی ختم ہو چکی تھی!

اور وہ بھی کتنا بزی تھا منگیتر کے ساتھ۔ صبح چار بجے بھی، دن کے بارہ بجے بھی، اور اِس وقت شام کے چھ بجے بھی۔

کوئی وقفہ بھی بیچ میں دیا تھا یا نہیں؟ اُس نے خود سے یوں سوال کیا۔ جسے زیب اُسکی explanation کال کر رہی تھی!

برائیٹن پیئر تک جا کر وہ لوگ واپس لوٹ آئے۔

ڈاکٹر ضیاء نے بوٹ روکی۔ تو سنگین خان نیچے جاتے ہوئے بوٹ سے اُتر گیا۔ اپنی موورنگ پر بوٹ باندھنے لگا۔

ڈاکٹر نائلہ کی طرف آ گیا۔ پھر دونوں نیچے آنے لگے۔

''ضیاء صاحب!'' نائلہ نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ''مجھے آپ کی یک طرفہ محبت اچھی نہیں

لگی۔ آپ مجھے اُس سے ملوا دیں۔ شاید میں کوئی ہیلپ کرسکوں۔'' اُس نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''آں۔۔۔ ملوا تو نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ مجھے ہی نہیں ملتی۔ تو آپکو کیا ملواؤں گا۔ ہاں اُسکا گھر میں نے معلوم کرلیا ہے۔ وہاں تک پہنچا سکتا ہوں۔ آگے آپ مدد کریں میری۔'' وہ واقعی پُر اُمید نظر آنے لگا۔

''ضرور۔ ویسے۔۔۔ نام کیا ہے اُس خوبصورت لڑکی کا؟'' نائلہ نے پوچھا۔

''زیب۔''

نائلہ کے کان کھڑے ہوگئے۔ پاکستانی، بے انتہا خوبصورت اور — زیب!

یقیناً وہی تھی!

رات ڈنر پر سنگین خان اُسے ایک sea side ریسٹورانٹ میں لے گیا۔

واپسی پر نائلہ ایک بار پھر پٹڑی سے اترنے لگی۔ انگلی سے اُس کے چہرے پر لکیر بناتی آگے بڑھنے لگی۔

"This is not fair." اُس نے اُس کا ہاتھ آہستہ سے ہٹا دیا۔

چند پل دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ وہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔

اور — ایکبار اور اُس نے اُسکی انگلی اپنی گردن پر دھیرے دھیرے چلتی محسوس کی۔

"What the hell are you doing?" اُس نے پھر سے اُس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا۔

دوبارہ نظریں سڑک پر جما دیں۔ وائینڈنگ روڈ تھی۔ توجہ طلب تھی۔ پر —

نائلہ باز نہیں آرہی تھی۔ آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کے اَدھ کھلے گلے میں سے اندر ڈال دیا۔

"Stay away from me." اُس کا ہاتھ باہر نکالتے ہوئے اُس نے پرے کر دیا۔

''گاڑی چلانے دو مجھے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

اور — وہ واقعی پرے ہو کر بیٹھ گئی۔

''میں اب بات بھی نہیں کروں گی تم سے۔'' وہ روٹھی روٹھی سی بولی۔

"That's like a good girl." جانے کیسے وہ یکدم خوشگواری سے بولا۔

''ہاں۔ خوش ہو جاؤ۔ نہیں کروں گی بات میں۔'' وہ مزید ناراض ہوگئی۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اُسکی طرف دیکھا۔ کہ وہ اُسے ناراض بھی تو نہیں کرسکتا تھا!

''دیکھو۔ روڈ وائینڈنگ ہے۔ محتاط ہو کر چلنا پڑتا ہے۔'' وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولا۔

''تو میں نے تمہارا ہاتھ روکا تھا؟''

وہ کیا کہتا؟ ایکبار پھر خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا۔

گھر پہنچے۔ لِونگ میں آئے۔ تو اُس نے اُسے 'گڈ نائیٹ' کہا۔ اور سیدھا اوپر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

کپڑے تبدیل کیئے۔ اور — قدرے ریلیکس ہونے اپنی بالکنی میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

مکمل سناٹا تھا چاروں اَور۔ سیاہ ریشمی رات تھی۔ شبنمی ہوائیں تھیں اور — پھولوں کی ہریالیوں کی، مستی جگاتی خوشبوئیں تھیں!

کچھ دیر وہیں بیٹھا وہ فطرت کی سرگوشیاں سن سن کر محظوظ ہوتا رہا۔ پھر —

دوبارہ اندر آگیا۔ لائیٹ آف کی۔ اور نرم و گداز بستر میں لیٹ گیا۔

سونے کی کوشش کر ہی رہا تھا۔ کہ —

دروازہ کھلتا، کوئی اندر آگیا۔

ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے لیمپ آن کیا۔ اُس کی توقع کے عین مطابق نائلہ تھی۔ وہی کل رات والا نائیٹ ڈریس پہنے!

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ بستر کی پشت سے تکیے لگاتے ہوئے ٹیک لگا لی۔

''اب کیا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''مجھے اُس کمرے میں ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ اُس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے تم یہاں سو جاؤ۔ میں وہاں چلا جاتا ہوں۔'' وہ اٹھنے لگا۔

''نہیں۔۔۔ دراصل مجھے اکیلے میں نیند نہیں آتی۔''

وہ تھک سا گیا۔ وہ جو چاہتی تھی۔ وہ اُسے نہیں دے سکتا تھا۔ خواہ مخواہ بے سود کوشش کر رہی تھی۔

''تو؟'' وہ بیزاری سے بولا۔

''میں یہیں سو جاؤں گی۔'' وہ اُسکا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''کہاں؟'' اُس نے اِرد گرد نظر ڈالی۔

''یہیں۔ تمہارے بیڈ پر۔۔۔''

''اور میں کہاں سوؤں گا؟''

''یہیں۔ اِسی بیڈ پر۔ دونوں اکٹھے سو جائیں گے۔''

اُس کے صبر کا پیالہ چھلک ہی اٹھا۔ بھاڑ میں جائے اُسکی مہمان نوازی!

وہ اٹھا۔ اپنے تکیے اٹھائے۔ اور کچھ بھی کہے سنے بنا کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔

نیچے ندیم کے بیڈروم سے ملحقہ چھوٹے سے خالی کمرے میں آ کر اُس نے کارپٹ پر لگے میٹریس پر اپنے تکیے رکھے۔ الماری سے کمبل نکالے۔ اور— وہیں میٹریس پر پڑ رہا۔

آج خلافِ معمول زیب کا فون ہی نہیں آیا۔ وہ سوتا رہ گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ندیم تھا۔ اُس کے لئے بیڈ ٹی لیکر آیا تھا۔

''ندیم۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود بنا لیتا'' وہ ممنون سا بولا۔ کہ ندیم اُس سے عمر میں بھی بڑا تھا۔ اور پھر— ایسے کاموں کے لئے مخصوص بھی نہیں تھا۔

''سر میں آج جلدی جاگ گیا تھا۔ بلکہ۔۔۔ نائلہ بی بی نے جگایا تھا۔۔۔''

''کیوں؟''

''کہتی تھیں۔ اُنہیں لنڈن کے لئے ٹرین پکڑنی تھی۔ ریلوے سٹیشن لے جانے کو کہہ رہی تھیں۔۔۔''

''اوہ۔'' اُسے افسوس سا بھی ہوا۔مگر —— وہ اُسکی ڈیمانڈز بھی تو پوری نہیں کر سکتا تھا!

''پھر؟'' وہ اُس کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے بولا۔

''سر۔میں اُنہیں ریلوے سٹیشن چھوڑ آیا۔۔۔واپس پہنچا تو اپنے لئے بھی چائے بنالی۔ آپکے لئے بھی۔اوپر گیا۔تو آپکا بیڈروم خالی تھا۔پھر یہاں چلا آیا۔۔۔''

''تھینک یُو۔'' اُس نے اُسکا شکریہ ادا کیا۔

ندیم واپس چل دیا۔اُس نے گھڑی پر نگاہ کی۔صبح کے نو بج رہے تھے۔

اُس نے گہری سانس لی۔حسبِ سابق زیب کو یاد دہانی کی ایک مِسڈ کال دی۔کہ بات تو وہ ویسے بھی نہیں کر رہی تھی۔پھر ——

اپنا کپ اٹھایا۔اور —— چائے پینے لگا۔

معاً —— اُس کے سیل پر ایک میسج آیا۔نائلہ کا تھا۔

''دنیا کی کوئی زیب تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی۔'' اُس نے کہا تھا۔

وہ مسکرا دیا۔ہولے سے۔

زیب اُسے کیا چھینتی۔وہ تو خود ہی خود کو اُس کے آگے سرنڈر کر چکا تھا!

نائلہ ٹرین میں بیٹھ چکی تھی۔کافی وقت گزر گیا تھا۔اِس خیال سے کہ زیب اب تک یقیناً جاگ چکی ہوگی۔اُس نے کل صبح چار بجے کے اُس کے سنگین خان کو کال کا اُس کا نمبر ملایا۔

''میں نائلہ بات کر رہی ہوں۔'' زیب کے کال ریسیو کرنے پر اُس نے کہا۔

زیب چند پل کو کنفیوزڈ سی ہوگئی۔''نائلہ'' اُس نے بھی سنا تھا۔مگر کب؟ کہاں؟ اتنی اچانک وہ یاد نہ کر پائی۔

''مجھے پہچانا نہیں؟ میں سنگین کی منگیتر ہوں۔کل۔۔۔صبح صبح ہم دونوں ابھی بیڈ میں تھے۔کہ تمہارا فون آیا۔۔۔''

''اوہ۔میں نے پہچان لیا ہے۔کہیے کیسے زحمت کی؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

اُسے بھی یقین تھا۔کہ وہ سنگین خان کے بیڈ میں تھی۔اُسے پتہ تھا سنگین خان کا سیل فون

رات کو اُس کے سرہانے بیڈ ٹیبل پر پڑا ہوتا تھا۔

''میں نے تمہارے ساتھ سنگین کے بارے میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔۔۔''

''جی۔بولیے'' وہ بڑے ضبط سے بولی۔

''بات دراصل یہ ہے۔کہ سنگین میرا منگیتر ہے۔ہمارے relations کا اندازہ تو تمہیں ہو ہی گیا ہوگا۔منگنی ہو جانے کے بعد ہم لوگ ایسے تعلق کو عیب نہیں سمجھتے۔سو۔۔۔۔جلدی ہی میں اُس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔بہتر ہوگا۔کہ تم اپنی راہ لو۔اور ہمیں اپنی راہ پر جانے دو۔۔۔۔''

''میں نے تم دونوں کی راہ بالکل نہیں روکی۔تم لوگ خوشی خوشی اپنی راہ پر جاؤ۔گڈ لک۔''

نائلہ کو اُس کا مضبوط اور اٹل لہجہ اچھا نہیں لگا۔اُس کا تو خیال تھا۔وہ گھبرائے گی۔مکرے گی۔اُس کے آگے صفائی پیش کرے گی۔یا پھر —— لڑ پڑے گی اُس سے۔مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔بات بہت جلدی ختم ہوگئی۔

''سنو۔'' خود وہ ہی شاید طوفان سے پہلے کی خاموشی سے ڈر گئی۔

''سناؤ۔'' اُس کا لہجہ اب بھی Firm تھا۔

''تم نے اگر کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی۔یا سنگین سے دوبارہ ملیں۔تو سمجھ لو۔اپنی شامت خود لے آئی ہوگی۔۔۔''

''بس؟ یا کچھ اور کہنا ہے؟'' وہ ہنس دی تھی۔

نائلہ کو آگ ہی تو لگ گئی۔

''اگر اُس سے دوبارہ رابطہ کیا۔تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''میں واقعی ڈر گئی ہوں۔'' وہ ہنستے ہنستے بولی۔''اب بند کروں؟''

اور —— نائلہ نے مزید کچھ کہے بنا فون بند کر دیا۔

جانے کیوں؟ اُسے پہلی بار اپنا آپ کسی لڑکی کے آگے اتنا بے بس لگا!

پھر ——

اُس نے برائیٹن میں ہی مقیم اپنی ایک کلوز فرینڈ سِدرہ کو فون کیا۔اُسے ڈاکٹر ضیاء اور زیب کے سیل نمبرز دیتے ہوئے دیر تک اُن کے بارے میں سمجھاتی اور ہدایات دیتی رہی۔کہ کیسے وہ

زیب بن کر ڈاکٹر سے بات چیت کرے گی۔ خاص طور پر شام کو۔ کہ بقول سنگین خان اور ڈاکٹر کے شام کی چائے وہ اکثر مل کر پیا کرتے تھے۔

وہ سنگین خان کو دکھانا چاہتی تھی۔ کہ اُس کی چہیتی زیب بھی اتنی پارسا نہیں تھی۔ جتنا وہ اُسے سمجھتا تھا۔ اُس کے دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ سنگین خان کی بے رخی کی وجہ زیب اور صرف زیب تھی۔ ورنہ تو اُس کی دانست میں وہ پاکستان میں وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔

سنگین خان — پیسہ ہی پیسہ اور — عیش ہی عیش تھا۔ وہ کسی طور اُسے کسی اور کا ہونے نہیں دے سکتی تھی۔ اُسے صرف اُس کا ہونا چاہیے تھا۔ اُس کا پیسہ اور عیش صرف اُس کے ہونے چاہیے تھے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح اُس کے والد اسفندیار خان کا پیسہ اور عیش اُس کی خالہ کے تھے۔

اُس کا فون اٹینڈ کر کے زیب بمشکل پچھلی طرف آئی۔ اور —

لان میں پڑی بینچ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بے اختیار رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کل صبح سے وہ سنگین خان کی بیوفائی پر برابر رو رہی تھی۔ پر —

اِس وقت تو ضبط کے سارے ہی بند ٹوٹ گئے۔ وہ اتنا روئی اتنا روئی۔ کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔

سنگین خان نے کہا تھا۔ کہ نائلہ کے ساتھ اُس کی بات ختم ہو چکی ہے۔ یہ بھی کہ اُس کے اور اُس کی منگیتر کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ 'اِس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ میں اُس کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔'

اُس کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ لیکن —

کل صبح حسبِ معمول اُسی کے کہنے کے مطابق صبح چار بجے جب اُس نے اُسے نماز کے لیے جگانے کو فون کیا تھا۔ تو فوراً نائلہ نے ریسیو کیا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ کہ وہ سنگین خان کے ساتھ اُس کے بیڈ میں تھی۔ سنگین خان نے خود کہا تھا۔ کہ وہ رات کو اپنا سیل فون اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتا تھا۔ پھر —

کل ہی اُس نے اُن دونوں کو 'The lanes' میں ایک پیومنٹ کیفے میں بہت

قریب سے دیکھا تھا۔ سنگین خان کی اُس سے نظریں بھی ملی تھیں۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ اُس کا کوئی ردِ عمل دیکھنے سے پہلے ہی اُس نے رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔ اور —

کل شام ہی ـــــ جب وہ لوگ بوٹ پر سیر کرنے نکلے تھے۔ تو مخالف سمت سے سنگین خان اور وہ بوٹ میں بیٹھے چلے آ رہے تھے۔ سنگین خان سامنے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ نائلہ اُس کے کندھے پر سر رکھے سرشار سی نظر آ رہی تھی۔ اور —

اِس وقت نائلہ کا فون پر یہ کہنا کہ وہ سنگین خان کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ اگر وہ یہاں برائیٹن آ کر اُس کے ساتھ سو سکتی تھی۔ تو وہاں اُس کے ساتھ بیڈ شیئر کرنے میں کیا قباحت ہو سکتی تھی؟

سنگین خان کا اصلی چہرہ کتنا گھناؤنا تھا؟

پھر — اُسے زینیہ یاد آ گئی۔ ایک امیر لڑکے کی ٹھکرائی اُس کی اپنی پیاری بہن۔ اُس کی جان!

وہ پھر رو دی۔ تڑپ تڑپ کر رو دی۔ اُسے اپنی بہن چاہیے تھی۔ وہ اُس کے کندھے پر سر رکھ کر رونا چاہتی تھی۔ بہت رونا چاہتی تھی۔ کہ —

آج اُس کو بھی ایک امیر لڑکے نے ٹھکرا دیا تھا۔ آج وہ بھی اُسی درد سے روشناس ہوئی تھی۔ جس سے زینیہ کا سامنا ہوا تھا۔ پر —

زینیہ اچھی تھی۔ مر گئی تھی۔ درد مٹ گیا تھا۔

وہ بھی مرنا چاہتی تھی۔ کہ یہ درد بہت ظالم تھا۔ سہا نہیں جا رہا تھا۔

رات پچھلی رات سے بھی زیادہ ظالم نکلی۔ وہ خود کو کم اور زینیہ کو زیادہ رو رہی تھی۔

آج وہ پوری طرح جان گئی تھی۔ کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ پیچھا چھڑانا چاہو بھی تو چھوٹتی نہیں۔ بھول جانا چاہو بھی تو بھولتی نہیں!

کچھ دنوں سے اُسے اپنا آپ بہت ظالم لگنے لگا تھا۔ سنگدل۔ کتنے سخت الفاظ میں اور کتنے طنزیہ انداز میں وہ زینیہ کو اُس لڑکے سے ملنے جلنے سے بات چیت کرنے سے منع کرتی تھی۔

بالکل یوں — جیسے سب کچھ اُس کے بس میں تھا۔ اور اُس کے کہتے ہی زینیہ مان جا
گی۔ اور اگر نہیں مانے گی تو بہن کی ناراضگی مول لے لے گی۔

کیا یہ سب اتنا ہی آسان تھا؟ کیا اپنی پہلی اور آخری محبت کو ترک کر دینا اتنا ہی سہل تھا؟

درد، درد اور — درد!

کیوں نہیں وہ بھی مر جاتی۔ ایک ناگہانی موت۔

یکدم ہی اُس کی جان چھوٹ جاتی اِس بیدرد درد سے!

وہ بھی مرجانا چاہتی تھی۔ کہ وہ بھی سنگین خان کو بہت چاہتی تھی!

''زیب بس کرو۔ تمہیں اتنا بھی احساس نہیں۔ کہ وہ اپنی منگیتر کے ساتھ دوبارہ تعلق جو
کر تمہاری انسلٹ کر رہا ہے۔۔۔'' رات کے کہے آصفہ کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجے۔

آصفہ نے بھی اُسے منع کیا تھا۔ بالکل اُسی کے الفاظ اور اُسے کے انداز میں جس میں اُم
نے زینیہ کو منع کیا تھا۔

مگر — زینیہ کیا مان گئی تھی؟ بلکہ — زینیہ کیا مان سکتی تھی؟

زیب بھی بے بس تھی۔ بالکل بے بس!

اور — وہ بھی مرجانا چاہتی تھی۔ بالکل زینیہ کی طرح۔ اچانک ہی!

دفعتاً اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی۔ کسی بھیانک سے فیصلے کی پُر اسراری دمک

دھوپ ڈھل رہی تھی۔ آسمان شفاف اور — ہوا ہمیشہ کی طرح تیز تھی۔

سنگین خان اور ڈاکٹر ضیاء اپنے گھروں کے باہر ساحل کے رخ سبزے پر کرسیاں ڈالے گپ شپ میں مصروف شام کے چائے پی رہے تھے۔

اُن سے پرے سمندر کے قریب چند منچلے پتنگیں اُڑا رہے تھے۔ اکا دکا کشتیاں آ جا رہی تھیں۔ اور — دُور بائیں جانب کوسٹل گارڈ اپنی پوسٹ پر کھڑا آس پاس پر نظریں جمائے تھا۔

سنگین خان کچھ چپ چپ سا تھا۔ زیب تو یوں خاموش ہو بیٹھی تھی۔ جیسے قطع تعلق ہی کر لیا تھا اُس سے۔ اُس نے کال کرنے کی بہتیری کوششیں کیں۔ اُس کے گھر کے اردگرد کئی چکر لگا ڈالے۔
نہ وہ بس سٹاپ کے آس پاس ملی۔ نا ہی کہیں باہر نظر آئی۔

وہ واقعی پریشان تھا۔ وہ مانتا تھا۔ نائلہ کو اُس کے ساتھ دیکھ کر وہ زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہوئی تھی۔ ناراضگی بھی اُس کا حق تھا۔

لیکن— وہ اُسے اتنا تو موقعہ دیتی۔ کہ وہ اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ سب کچھ جان کر وہ شاید اُسے معاف بھی کر دیتی۔ مگر—

وہ نظر تو آتی؟ کہیں دکھائی تو دیتی؟

''یار آج میں بہت خوش ہوں۔'' اچانک ڈاکٹر چہکا۔

وہ اپنی سوچوں سے اُبھرا۔ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ میز پر رکھا۔

''مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے۔'' اُس نے کہا۔

سنگین خان نے واقعی نوٹ کیا تھا۔ آج وہ اپنے روٹین سے متعلق تھکا تھکایا سا شکایت آمیز لہجے میں باتیں نہیں کر رہا تھا۔ فریش لگ رہا تھا۔ بالکل۔

''پوچھو گے نہیں کیوں خوش ہوں؟''

''کیوں خوش ہو؟'' اُس نے پوچھ ہی لیا۔

''وہ۔۔۔زیب ہے نا۔ اُس نے آخر خاموشی توڑ ہی دی۔ بات کرنے لگی ہے مجھ سے۔۔۔''

چونکتے ہوئے سنگین خان نے اُس کی طرف دیکھا۔

اُسے اپنا رنگ صاف نچڑتا ہوا محسوس ہوا۔

''فون کرتی ہے کبھی کبھی۔'' اُس کے دلی جذبات سے بے خبر وہ کہتا گیا۔ ''ہاں میں ہر رات گپ شپ کرتا ہوں۔۔۔ بہت سویٹ لڑکی ہے۔۔۔''

اُس کے الفاظ اُس کے کانوں میں پگھلے سیسے کی مانند پڑ رہے تھے۔

اُس نے نظریں سامنے جاری تھیں۔ مبادا ڈاکٹر اُس کی کمزوری جان جائے۔

اب ڈاکٹر سامنے پتنگ اُڑاتے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے موضوع اپنے لڑکپن کی طرف پھیر دیا تھا۔ کہ کیسے وہ بھی پتنگ اُڑانے کا بہت شوقین تھا وغیرہ۔ لیکن—

سنگین خان کہیں گم ہو گیا تھا۔ گم سم ہو گیا تھا۔

ہاں— یہ خیال ضرور آ رہا تھا۔ کہ زیب بظاہر جتنی نازک اور فریجائل تھی۔ اُتنی ہی اندر سے سخت اور پتھر کی بنی تھی۔

اُس سے ایسا بدلہ لیا تھا۔ کہ اُس کی روح تک مجروح ہو گئی تھی۔ اُس کے اتنے قُرب میں مقیم ڈاکٹر کے ساتھ پینگ بڑھائی تھی۔ کہ اُس کے گھر میں کھٹکا بھی ہوتا۔ تو سنگین خان کے گھر میں سنائی دے جاتا۔

وہ— تلخی سے مسکرایا۔

وہ زیب کو بہت اچھا سمجھتا تھا۔ اُس کے خیال میں وہ اُس کے علاوہ کسی اور مرد سے تعلق نہیں رکھ سکتی تھی۔ بہت نیک لڑکی تھی۔

نیک تو وہ اب بھی تھی۔ دل نے کہا۔ صرف بدلہ لے رہی تھی اُس سے۔

لیکن— ایسی بھی تو لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جو مرد کی بیوفائی کو سینے سے لگائے زندگی گزار دیتی ہیں۔ کسی اور مرد کی طرف نظر تک نہیں اٹھاتیں۔ وہی بے وفا ہی اُن کا سب کچھ ہوتا ہے۔

زیب بھلے اُسے چھوڑ دیتی۔ بھول جاتی۔ مگر ایسا نہ کرتی۔ یہ اُس کی محبت کی توہین کے ساتھ ساتھ اُس کی غیرت پر بھی وار تھا۔

معاً ڈاکٹر ضیاء کا سیل فون بج اٹھا۔ اور— سنگین خان کی محویت ٹوٹی۔

ڈاکٹر اپنا سیل لیے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند قدم آگے چل کر باتیں کرنے لگا۔

سنگین خان خالی خالی نظروں سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ خنکی بڑھ رہی تھی اور— ساحل پر کے لڑکے اپنی پتنگیں واپس لپیٹنے لگے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر واپس آ گیا۔

''زیب کا فون تھا۔'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ سرشار سا بولا۔

اُسے بھی یہی لگا تھا۔ اِس سے قبل ڈاکٹر نے اتنی پرائیویسی کبھی نہیں برتی تھی۔ کیتھی کی کال پر بھی نہیں۔ بہرحال —

''اب چلنا چاہیے۔ سردی بڑھ رہی ہے۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

اور —— دونوں اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

سنگین خان رات بھر بے چین رہا۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا۔

''وہ زیب ہے نا۔۔۔ بات کرنے لگی ہے مجھ سے۔۔۔ بہت سویٹ لڑکی ہے۔''

ڈاکٹر کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''زیب تم مجھے چھوڑ دیتیں۔ بھول جاتیں۔ مگر ایسا بدلہ نہ لیتیں۔ اُس کی روح کراہ اٹھی۔

فجر کی نماز کے بعد ربِ ذوالجلال کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تو اپنے لیے دل کا سکون مانگا۔ کہ صرف وہی اُسے سکون دے سکتا تھا!

نو بج رہے تھے۔ وہ نیچے لِونگ میں بیٹھا حسبِ معمول ٹی وی آن کیے ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔

فُل لینتھ چوڑی خوبصورت کھڑکی کے اُس پار کہر ہی کہر تھی۔ اندر بھی سب نیم روشن تھا۔

اُس نے لائیٹ آن نہیں کی تھی۔ یوں ہی کھویا کھویا سا ٹی وی پر نظریں جمائے تھا۔

تبھی —— ندیم نے آکر وہیں اُس کے آگے رکھی میز پر ناشتہ لگا دیا۔

وہ جوس کا گلاس اٹھا کر پینے لگا۔

ابھی دو ہی گھونٹ لیے تھے کہ اُس کا سیل بج اُٹھا۔

دیکھا —— اجنبی سا نمبر تھا۔

"Sangeen Khan speaking" وہ ریسیو کرنے لگا۔

''میں زیب کی کزن آصفہ بول رہی ہوں۔'' اُس طرف سے آواز آئی۔

وہ چونک سا اٹھا۔

''جی —— بولیے۔''

''سنگین خان۔ رات ایک بجے زیب نے سلیپنگ پلز کھا لی تھیں۔ بہت بُری حالت میں ہم اُسے ہوسپٹل لے گئے۔ میں آپ کو اس لیے فون کر رہی ہوں۔ کہ اُس نے یہ سب آپ کی وجہ سے کیا ہے۔ آپ اِس کے ذمہ دار ہیں۔۔۔''

وہ حیران سا سب سن رہا تھا۔ اُس کا غصہ بھی برداشت کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟

وہ بھی زیب سے ناراض تھا۔ غصہ بھی تھا۔ خفا بھی تھا۔ ڈاکٹر کے ساتھ بات چیت کر کے اُس نے اُس کی توہین کی تھی۔ لیکن ایسا کچھ ہو۔ اُس نے ہرگز نہیں چاہا تھا۔

''کیسی ہے وہ؟'' اُس نے متانت سے پوچھا۔

''بچا لیا ہے ڈاکٹروں نے۔'' اب اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

''کس ہوسپٹل میں ہے؟''

آصفہ نے اُسے ہوسپٹل اور روم نمبر بتا دیا۔ لیکن ——

''اگر آپ کی منگیتر تھی۔ تو آپ زیب کے ساتھ کیوں فلرٹ کر رہے تھے؟'' وہ مزید بولی۔ اب بھی جیسے جلی بیٹھی تھی۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سامنے تکتا رہا۔ پھر ——

''او کے۔ خدا حافظ۔'' اُس نے اپنے مخصوص مدھم لہجے میں کہا۔ اور فون بند کر دیا۔ کہ —— وہ کیا کہتا؟

ہاں —— اَپ سیٹ ضرور ہو گیا تھا!

وہ اُسے بے حد چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا۔ یہ بھی کہ وہ اُسے کسی اور لڑکی کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مگر نائلہ کے سلسلے میں تو اُس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ زیب کو شدید غلط فہمی ہوئی تھی۔ اُس سے بات کر لیتی۔ تو یہ نوبت نہ آتی۔

پھر اُسے خیال آیا۔ وہ اُسے اتنا چاہتی تھی۔ کہ بات خودکشی تک لے گئی تھی۔ تو پھر ڈاکٹر کے ساتھ کیوں بات چیت کرنے لگی تھی؟

اُسے سے بدلہ لینے؟

کسی اور طریقے سے بھی تو اُسے ستا سکتی تھی۔ اتنا گرا ہوا راستہ کیوں اپنایا؟

اُس نے جلدی جلدی جوس ختم کیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ اور —— ہوسپٹل چل دیا۔

زیب کے ساتھ اُس کا کوئی رشتہ دار ہوا۔ تو وہ اپنا تعارف کس ناطے سے کروائے گا؟ کیا اُنہیں بھی معلوم ہوگا۔ کہ زیب نے ایسا قدم اُس کی وجہ سے اٹھایا تھا؟

یہی سوچتا وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

لیکن —— زیب کو ملنا، اُس کو پوچھنا اُس کا اخلاقی فرض تھا۔ چاہے کوئی کچھ بھی سوچتا۔

پھر—— وہ سخت پریشان بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا اُسے بہت زیادہ۔ اُسے سچ مچ کچھ ہو جاتا تو؟ اِس سے آگے وہ سوچ نہیں پا رہا تھا۔

ہوسپٹل پہنچا۔ اُس کے کمرے میں گیا۔ زیب کی خالہ بھی تھیں وہاں۔ اُس نے اپنا تعارف کروایا۔ تو اُس کی توقع کے بالکل خلاف اُسے بہت خلوص سے ریسیو کیا۔ ایسا لگتا تھا۔ کہ وہ اُسے کے بارے میں پہلے سے جانتی تھیں۔

زیب بستر پر آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ بہت کمزور اور مضمحل لگ رہی تھی۔ رات کیسی بیتی ہوگی اُس کی؟ وہ اندازہ کر سکتا تھا۔

وہ خود کو مجرم سا سمجھنے لگا۔

کچھ دیر وہیں بیٹھا وہ اُس کی خالہ کے ساتھ اُسی کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔

کافی سیریس حالت میں وہ لوگ اُسے ہوسپٹل لائے تھے۔ آج کا دن ڈاکٹرز نے اُسے انڈر ابزرویشن رکھا تھا۔ وغیرہ۔ پھر——

اپنی ہر ممکن تعاون کی آفر کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں شام کو پھر آؤں گا۔'' اُس نے کہا۔ اور——

باہر نکل آیا۔

شام ٹھیک چھ بجے اُس نے زیب کے دروازے پر دستک دی۔

اندر آیا۔ اِس وقت زیب اکیلی تھی۔ کوئی اور نہیں تھا وہاں۔

اُس نے تھکی تھکی آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ پھر —— نظریں واپس پھیر لیں۔

خفا تھی اُس سے اب بھی۔ پر——

خود بھی تو ڈاکٹر کو فونز کرتی تھی۔ لمحہ بھر کو اُس نے سوچا۔ پھر فوراً ہی خیال جھٹک دیا۔ یہ وقت اِن باتوں کا نہیں تھا۔ وہ مرتے مرتے بچی تھی۔ اُس کو دیکھنا تھا۔

وہ پاس چلا آیا۔ اُس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

دنوں بعد اُسے اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ بھلا دیا سب کچھ۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اُس کے بال سہلاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

اُس نے اُس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اُسے معلوم تھا۔ وہ صرف اُسے چاہتی تھی۔ نائلہ کو اُس کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ ردعمل یہی ہونا تھا۔

''خفا ہو؟'' اُس نے بستر پر رکھے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔ چپ رہی اب بھی۔ ہنوز دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

''زیب۔'' وہ اپنے مخصوص مدھر لہجے میں بولا۔

مگر—— زیب اب بھی خاموش تھی۔

وہ بہت کچھ کہتی۔ لیکن ابھی تک اُس میں ذہنی اور جسمانی طور پر اتنی طاقت نہیں تھی۔ کہ اِس تلخ موضوع پر بات کر سکتی۔

''اچھا تم مت بولو۔ مجھے تو اپنی صفائی دینے دو۔۔۔''

''مجھے کوئی صفائی نہیں چاہیے۔'' کمزوری کے باوجود اُس کے لہجے میں تندی تھی۔

''میں صفائی دوں گا۔ کیونکہ تمہاری حالت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔ اوپر سے یہ بوجھ بھی لیے رہو۔ تو اچھا نہیں ہے۔''

اُس کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھر آئیں۔ بے یقینی کی۔ بیزاری کی۔

پر —— سنگین خان نے کوئی توجہ نہیں دی۔

''میرے قطع تعلق کے باوجود وہ اُس شام میرے گھر آ گئی۔ رات ڈنر کے بعد میرا خیال تھا۔ کہ وہ واپس لنڈن اپنے گھر چلی جائے گی۔ مگر وہ نہیں گئی۔ میں اُسے رات گزارنے کسی ہوٹیل لے جانے لگا۔ مگر وہ نہیں مانی۔ وہیں پاس والے بیڈ روم میں سونے چلی گئی۔ رات تین بجے میں جاگ رہا تھا۔ کھانسی ہو رہی تھی مجھے بہت۔ اتنے میں نائلہ اندر آ گئی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ مجھے لڑکیوں کی ایسی حرکات کبھی اچھی نہیں لگیں۔ وہ بہت ڈھیٹ لڑکی ہے۔ میرے بستر میں گھسنے کی کوشش

کرنے لگی۔۔۔"

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ تفصیلاً بتانا اچھا نہیں سمجھا۔ پھر—

"میں۔نے اُسے وہیں بستر میں چھوڑا۔ اور خود اُٹھ آیا۔" وہ دوبارہ کہنے لگا۔ "نیند ویسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہاتھ منہ دھوئے اور نیچے آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا۔ چار بجے تمہاری کال آئی تھی۔ دوبارہ اوپر اپنے کمرے میں گیا۔ وہ جا چکی تھی۔ میں نے سیل چیک کیا۔ تمہاری کال واقعی آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نائلہ نے تمہاری کال ریسیو کی تھی۔ تمہارا نام، تمہارا نمبر سب دیکھ چکی تھی۔

پھر— اُس نے شوپنگ کرنی تھی۔ میں نے شوپنگ کرا دی۔ کیونکہ وہ— بہر حال مہمان تھی میری۔ وہیں تم نے پیومنٹ کیفے میں اُسے میرے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا۔ مجھے تمہاری ناراضگی کا احساس تھا۔ لیکن— کیا کرتا۔ "منگیتر نہ سہی کزن تو ہے نا۔۔۔"

"منگیتر ہی ہے۔" زیب اچانک گویا ہوئی۔ "اُس نے مجھے فون کر کے بتایا تھا۔ اور یہ بھی کہ چونکہ آپ ہی کے بیڈ سے اُس نے میری کال ریسیو کی تھی۔ تو مجھے اُس کے آپ کے ساتھ relations کا اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ اور کہ۔۔۔ منگنی ہو جانے کے بعد آپ لوگ ایسے تعلق کو عیب نہیں سمجھتے۔ سو۔۔۔ جلدی ہی وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس لیے مجھے اپنی راہ الگ کر لینی چاہیے تھی۔۔۔" کہتے کہتے اُس کی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

"گوڈ!" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

پھر— انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو پونچھے۔

"اُس نے ایک ایک لفظ جھوٹ بولا ہے۔ میری بات کا یقین کرو۔ وہ سمجھے نہ سمجھے۔ میں ایسے تعلق کو عیب سمجھتا ہوں۔ وہ دونوں راتیں آئی تھی میرے پاس۔ مگر— وہ پاگل ہوئی تھی۔ میں نہیں۔۔۔"

زیب نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ یہ دیکھنے کہ کیا وہ سچ بول رہا تھا؟

اُس کی آنکھوں میں سچ ہی سچ تھا!

"Trust me" اُس نے ہولے سے کہا۔

اور— زیب رو دی۔ جانے کیوں بے اختیار جی بھر آیا تھا۔ کیا کچھ نہیں گزری تھی اُس پر

پچھلے چند دنوں میں!

"میں۔۔۔ مر جانا چاہتی تھی۔ مجھ سے آپ کی بیوفائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ سوچا۔۔۔ پلز کھا کر ختم ہو جاؤں گی۔ کسی اور کے ساتھ آپ کو دیکھ کر میرا درد مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔۔۔"

سنگین خان نے گہری سانس لی۔

"اگر سچ مچ تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟ میں تو پاگل ہو جاتا۔ اب میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ بغیر سچ جانے تم نے اتنا انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ واقعی کچھ ہو جاتا تمہیں تو؟ میں تو۔۔۔" وہ بے طرح پریشان نظر آنے لگا۔

وہ خاصی تھک گئی تھی۔ آنکھیں موند لیں۔ مگر— خوبصورت چہرے پر اطمینان کی دمک تھی!

وہ یوں ہی بیٹھا اُسے تک رہا تھا۔

"آصفہ کہتی تھی۔ سیدھا سیدھا پولیس کیس تھا یہ۔۔۔" آنکھیں موندے موندے ہی وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں — وہ بہت غصہ تھیں مجھ پر۔۔۔ میں اُن کا reaction سمجھ سکتا ہوں۔"

"کیا؟" اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ "وہ ملی تھی آپ سے؟"

"نہیں۔ فون کیا تھا۔"

"سب گھر والوں کو ساری بات کا پتہ بھی چل گیا ہے۔" وہ نادم سی بولی۔ "خالہ بچاری نے اصل بات چھپانے کو ڈاکٹر سے کہا ہے۔ کہ اُنہوں نے بوتل ٹوٹ جانے کی وجہ سے اپنی سلیپنگ پلز میری دوائی سے ملتی جلتی بوتل میں ڈال دی تھیں۔ اور میں نے غلطی سے۔۔۔"

"تم نے ہی سب کو مشکل میں ڈالا ہے۔ میری بات شروع میں ہی سن لیتیں۔ تو یہ سب نہ ہوتا۔ اب تو میں۔۔۔ پولیس کو بتاؤں گا یہ سب۔۔۔" وہ مسکراتے مسکراتے کہہ رہا تھا۔

"کیا بتائیں گے؟" اُس نے خوشگواری سے پوچھا۔

"یہی کہ تم مجھے اتنا چاہتی ہو۔ کہ کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھ کر برداشت نہ کرتے ہوئے تم

نے جان بوجھ کر پلز کھالی تھیں۔۔۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"وہ تمہیں لاک اَپ میں بند کر دیں گے۔" وہ آرام سے بولا۔

"میں اتنی بیمار ہوں۔ پھر بھی مجھے بند کریں گے۔"

"نہیں۔ وہ تمہارے ٹھیک ہونے کا انتظار کرلیں گے۔"

"آپ۔۔۔ بہت بُرے ہیں۔"

"اچھا چلو میں بھی تمہارے ساتھ لاک اَپ میں بند ہو جاؤں گا۔"

"نہیں"

"پھر؟"

"ہم دونوں میں سے کوئی بھی بند نہیں ہوگا۔"

چند پل وہ اُسے اڈورنگ نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر—

باری باری اُس کی حسین آنکھوں پر پیار کرلیا۔

"ہاں۔ ہم دونوں آزاد رہیں گے۔ ایک دوسرے سے پیار کریں گے۔ ایک دوسرے کے لیے جئیں گے۔۔۔" کہتے کہتے ہی وہ چپ سا ہوگیا۔

"ایک بات پوچھوں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی زبان پر آ گیا۔ کہ اُس کے دل پر بھی تو بے حساب بوجھ تھا۔

"پوچھیں۔"

"ڈاکٹر ضیاء کو کیوں فون کرتی تھیں؟" وہ براہِ راست بولا۔

"کون ڈاکٹر ضیاء؟" وہ کچھ نہ سمجھ پائی۔

"میرا دوست جو میرے پڑوس میں رہتا ہے۔"

"وہ جو ریسٹورانٹ میں میری ٹیبل پر آیا تھا۔"

"ہاں"۔

"میں فون کرتی تھی اُس کو؟" زیب نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں۔ تم فونز کرتی تھیں ڈاکٹر ضیاء کو۔" اِس بار وہ firmly بولا۔ چہرے پر تاریک سائے منڈلا رہے تھے۔

"اُس نے بتایا آپ کو؟"

"میرے سامنے بھی آیا تھا تمہارا فون۔"

"پلیز سنگین! اگر یہ مذاق ہے۔ تو بھی میں برداشت نہیں کروں گی۔۔۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ تم مجھ سے بدلہ لے رہی تھیں نا۔ کہ اگر میں نائلہ کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ تو تم میرے دوست کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھیں۔۔۔"

"میں اتنا گندا بدلہ لوں گی۔ اتنی گری ہوئی حرکت کروں گی؟"

کمزور تو تھی ہی۔ سنگین خان کے اتنی وثوق سے کہی بات پر آنکھوں میں ایکبار پھر آنسو آ گئے۔

سنگین خان سخت پریشان تھا۔ وہ تو یوں بول رہی تھی۔ جیسے اُس نے کوئی انہونی بات کہہ دی تھی۔

"میرے پاس تو اُس کا فون نمبر بھی نہیں ہے۔ مجھے وہ سخت بُرا لگتا ہے۔ شروع دن سے ہی۔۔۔" وہ کہتی جا رہی تھی۔ اور روتی جا رہی تھی۔

سنگین خان گھبرا سا گیا۔ مزید پریشانی اُس کے لیے ٹھیک نہیں تھی۔ وہ یہ ذکر نہ ہی چھیڑتا تو اچھا تھا۔ بہرحال —

"پلیز زیب!" وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"سوری زیب۔ مجھے ایسی بات اِس وقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"اچھا ہے کہ کہہ دی۔ اگر میں آپ کو کسی اور لڑکی کے ساتھ برداشت نہیں کر پائی۔ تو آپ کو بھی تو بُرا لگا ہوگا۔۔۔"

سنگین خان کو لگ رہا تھا۔ کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ مگر—

ڈاکٹر اُس کے سامنے ہی تو فون ریسیو کر رہا تھا۔ خیر—

"بس پلیز! بھول جاؤ اِس بات کو۔" عجیب مخمصے میں ہونے کے باوجود وہ اُسے تسلی دینے

لگا۔

کیونکہ وہ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔ اُسے وقت دینا چاہیے تھا اُسے۔

زیب نے اپنے آنسو پونچھے۔ ماتھے پر گھر آئے بال پیچھے ہٹائے۔ چند پل اُسے دیکھ رہی۔

''آپ مذاق کر رہے تھے نا؟ پلیز کہہ دیں کہ آپ مذاق کر رہے تھے۔'' اُس کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔

''ہاں'' کہے یا ''نہ''۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''چھوڑو یہ بات۔ ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔''

وہ چند پل سوچتا رہا۔ کہ کیا کہے؟ اور —

''میں تمہیں اپنے بابا سے ملواؤں گا۔ تم سے مل کر وہ بہت خوش ہوں گے۔۔۔'' وہ ماح کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنے لگا۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے وہ خوش ہوں گے؟'' اُس نے بھی بات بدل دی۔ کہ وہ جا چاہتا تھا!

''کیونکہ میری پسند ہمیشہ اُن کی پسند ہوتی ہے۔''

''اِس دفعہ نہ ہوئی تو؟''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''اتنے Sure کیوں ہیں؟''

''بس چپ۔'' اُس کے چہرے پر جھکتے ہوئے اُس نے اُسے پیار کر لیا۔ زیادہ بولنے تمہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ کہ ڈاکٹر نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔

تھوڑی دیر وہ اور وہاں بیٹھا رہا۔ پھر —

''اب چلتا ہوں۔ ہاں۔'' ایکبار پھر وہ اُس پر جھک آیا۔ ایکبار پھر اُسے پیار کیا۔

"Now you give me a kiss" اب اُس نے اپنا گال اُس کے ہونٹوں پر رکھ د

پھر — اُس نے زیب کے پرکشش لبوں کا ایک مبہم سالمس محسوس کیا۔ اور — سرشار ہو گیا۔

"I love you" وہ اٹھتے اٹھتے بولا۔

"I love you too" وہ بھی ہولے سے بولی۔

اور — سنگین خان پُروقار انداز میں چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

رات کی تاریکیاں گھر آئی تھیں۔ ہر سُو سناٹا چھایا تھا۔ ایسے میں چاروں دوستوں کے مدھم سے روشن دودھیا گھر کسی ماہر پینٹر کا شاہکار لگ رہے تھے۔

اپنی بالکنی میں بیٹھا اطراف پر نظریں جمائے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے کوفی پی رہا تھا۔

آج رات ڈاکٹر نے اُسے باہر کسی ریسٹورانٹ میں ڈنر کھانے کا کہا تھا۔ لیکن —

کل شام جو وہ دونوں نیچے ساحل کی طرف چائے پینے بیٹھے تھے۔ تو ڈاکٹر کا زیب کا ذکر کرنا اور پھر قدرے الگ جا کر اُس کا فون ریسیو کرنا اُس نے بمشکل برداشت کیا تھا۔ زیب کے ساتھ ساتھ اُس کو ڈاکٹر پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ آج بھی وہ زیب کا ذکر لے بیٹھتا۔ تو وہ چپ نہ رہ پاتا۔

وہ شروع سے ہی زیب کی بات دل میں چھپائے تھا۔ ڈاکٹر دوست سہی۔ مگر ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا ڈاکٹر اپنی طرف سے زیب کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ پھر بھی خاموش تھا۔ جب تک اُس کی بات زیب کے ساتھ پکی نہ ہو جاتی۔ وہ خواہ مخواہ اُس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ بات اب حد سے گزر رہی تھی۔

وہ اِس بات پر بھی خاصی شش و پنج میں تھا۔ کہ زیب تو سرے سے مان ہی نہیں رہی تھی۔ کہ ایسا ہوا بھی تھا۔

وہ یہ بھی سوچ رہا تھا۔ کہ اگر وہ ڈاکٹر کے ساتھ گپ شپ کرنے لگی تھی۔ تو اُس کی دانست میں اُس کی بیوفائی پر خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی؟

کنفیوزڈ سا اپنی سوچوں میں گم تھا۔ کہ سامنے اپنے گھر سے نکلتا ڈاکٹر دکھائی دیا۔ وہ یقیناً اُسے ڈنر پر ساتھ لینے آ رہا تھا۔

وہ بالکنی سے اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ جلدی جلدی اُسے سیل پر میسج دیا۔ اُس کے ساتھ ڈنر پر جانے سے معذرت کر لی۔

پر— لمحوں میں ہی ڈاکٹر کی ندیم سے انٹرکوم پر بات ہوئی۔ اور اُس نے دروازہ کھول دیا۔ لِونگ روم میں بیٹھتے ہوئے اُس نے ندیم کو اوپر سنگین خان کو اپنی آمد کا بتانے بھیج دیا۔

ناچار— اُسے آنا پڑا۔

''یار یہ کیا بات ہوئی۔ کہ عین موقعے پر ڈنر پر جانے سے انکار کر دیا۔'' چھوٹتے ہی وہ بولا۔

''بس یوں ہی۔ کوئی خاص دل نہیں کر رہا تھا۔'' اُس سے بہانہ نہ بن پڑا۔

''چلو چلیں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ چند ثانیے خاموش رہا۔ کہ نہ جانے کوئی معقول وجہ ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

پھر— وہیں صوفے کی پشت پر پڑی اپنی جیکٹ اٹھائی۔ اور ساتھ چل دیا۔

ریسٹورانٹ جا کر اپنی پسند کے سنیکس بنوائے اور کھانا کھانے لگے۔

گپ شپ کے دوران اِس وقت پھر ڈاکٹر کا سیل بج اٹھا۔ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ریسیو کر لیا۔

وہ خاصا فرینک لگ رہا تھا بات کرتے ہوئے۔ لگتا تھا زیب کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ کافی آگے نکل گیا تھا۔ بہرحال اُس سے بعد میں بات کرنے کا کہہ کر اُس نے بند کر دیا۔

سنگین خان سخت اَن ایزی محسوس کر رہا تھا۔ زیب اُس سے اتنی معصومیت سے جھوٹ بول سکتی تھی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں زیب تک پہنچ سکوں گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' ڈاکٹر خود ہی گویا ہوا۔ ''یہ سارا کریڈٹ نائلہ بھابھی کو جاتا ہے۔''

سنگین خان زور سے چونکا۔

''نائلہ کو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں یار۔ نائلہ بھابھی نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ میں اُنہیں زیب سے ملوا دوں۔ تو وہ میری

ہیلپ کریں گی۔ میں نے کہا۔ 'ملوا تو نہیں سکتا۔ وہ مجھے ہی نہیں ملتی تو آپ کو کیا ملواؤں گا۔ ہاں اُس کا گھر میں نے معلوم کر لیا ہے۔ وہ بتا دوں گا۔ آگے آپ میری مدد کریں'۔ سو اُنہوں نے میری سفارش کر دی۔ اور یوں ہماری بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔۔۔''

گوڈ! کچھ تھا اِس سفارش میں!! اُس کے دل نے کہا!!

پریشان سا وہ کھانے میں مصروف رہا۔ اُس کی باتوں کو 'ہوں' 'ہاں' میں جواب بھی دیتا رہا۔

واپس آئے۔ تو ڈاکٹر نے کوفی پینے کے لیے اپنے گھر پر روک لیا۔

وہ لِونگ روم میں بیٹھ گیا۔ اور ڈاکٹر کوفی بنانے کچن میں چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہیں میز پر رکھا ڈاکٹر کا سیل ایکبار پھر روشن ہوا۔ میسج تھا کسی کا۔

بہرحال —

ڈاکٹر کوفی لے آیا۔ اُسے بھی کپ پکڑایا اور خود بھی اپنا کپ لیے اُس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اپنے سیل پر نگاہ کی۔

میسج پڑھنے لگا۔ نمبر پر اُس کی بھی نظر پڑ گئی۔ خیر— اُس نے توجہ واپس اپنی کوفی کی طرف کر لی۔

ڈاکٹر نے میسج کا مختصر سا جواب دیکر واپس اپنے قریب رکھ لیا۔

''بڑے میسجز آ رہے ہیں یار۔'' سنگین خان نے اُسے چھیڑا۔

''زیب کا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

اور—

سنگین خان ایکبار پھر زور سے چونکا۔

یہ نمبر زیب کا نہیں تھا۔ جبھی تو اُس نے ڈاکٹر کو چھیڑا تھا۔ زیب کے پاس ایک ہی سِم تھا۔ اُسے معلوم تھا۔ پھر؟

کیا نائلہ زیب بن کر اُس سے بات کر رہی تھی؟

مگر ڈاکٹر تو نائلہ کی آواز پہچانتا تھا!

عجیب سی بھول بھلیوں میں الجھا وہ کوفی پیتا رہا۔ پھر ڈاکٹر سے اجازت لی۔ اور گھر آ گیا مگر — اندر نہیں گیا۔ گیرج سے گاڑی نکالی۔ اور قریبی ٹیلیفون بوتھ کی طرف چلدیا۔

اُس کے ذہن و دل میں ہلچل مچی تھی۔ یہ لڑکی جو بھی تھی۔ زیب نہیں تھی۔

نائلہ نے کیا گل کھلایا تھا وہ جاننا چاہتا تھا۔

ٹیلیفون بوتھ کے قریب پہنچتے ہوئے اُس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ اور اندر جا کر وہی نمبر ملانے لگا۔ جو اُس نے ڈاکٹر کے سیل پر دیکھا تھا۔

"Who is this?" اُس طرف سے کسی لڑکی نے پوچھا۔

اور — یہ زیب ہرگز نہیں تھی۔ خیر —

"Aren't you Ann? اُلٹا اُس نے سوال کر دیا۔ جیسے وہ تو کسی این سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نمبر کسی اور کا مل گیا تھا۔

"No this is Sidra" اُس نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

تو — ڈاکٹر کو سِدرہ فون کرتی تھی۔ اور سِدرہ اپنا نام زیب بتاتی تھی۔ ڈاکٹر کو خاص طور سے ایسے اوقات میں فون کرتی تھی۔ جب وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا۔ تا کہ ایک نہ ایک دن اُسے پتہ چل ہی جائے۔ کہ زیب ڈاکٹر کے ساتھ پینگیں بڑھانے لگی تھی۔

کیا زبردست گیم کھیلا تھا نائلہ نے!

کافی دیر سٹیئرنگ وہیل پر سر رکھے وہ اپنی پریشانی اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر — زیب صرف اُسی کی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کو فون کرنے کی اور اُس سے بدلہ لینے کی گھٹیا حرکت نہیں کی تھی۔ اُسے خیال آیا۔ اور — سرور سا چھا گیا اُس پر۔

دنوں بعد ہلکا پھلکا ذہن لیے وہ گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

سنگین خان فہد بن عبدالعزیز اور پیٹر کے مکانات اُن کی اپنی ذاتی پراپرٹی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر ضیاء پچھلے تین سالوں سے یہاں کرائے پر رہ رہا تھا۔ سب آپس میں بہت خلوص سے رہ رہے تھے۔ پیٹر شروع میں typical انگریزوں کی طرح تھا۔ نظر آ گیا۔ تو 'ہیلو' 'ہائے' کہہ دیا۔ ورنہ اللہ اللہ خیر۔ مگر آہستہ آہستہ ضیاء فہد اور سنگین خان کے دیکھا دیکھی وہ بھی اِن میں گھل مل گیا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ندیم سے خاص طور پر ریکویسٹ کر کے پراٹھا بنواتا۔ اور کھاتے ہوئے تعریفیں کرتے نہ تھکتا۔ پچھلی سردیوں میں تو وہ اور فہد سنگین خان کے گھر پاکستان بھی چلے آئے تھے۔ خوب خوب سیریں کی تھیں۔ جی بھر کر انجوائے کیا تھا۔

وہ دونوں بابا سے بھی بہت اِمپریسڈ تھے۔ جب بابا سنگین خان کی کسی دل کو لگتی بات پر اُس

کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے، خوشگوار قہقہہ لگاتے۔ تو اُن سب کو بہت اچھا لگتا۔

"Your father is unsurpassing". پیٹر اکثر کہتا۔

اور — آج اُس کے بابا اسفند یار خان آرہے تھے۔ سبھی دوست خوش تھے۔

لنچ پر ڈاکٹر ضیاء نے سب کو ایک عمدہ ریسٹورانٹ میں مدعو کیا تھا۔ پیٹر نے سب کو اپنے گھر پر شام کی چائے پر انوائیٹ کیا تھا۔ اور — فہد بن عبدالعزیز نے رات سب کو اپنے گھر پر ہی شاندار روایتی عربی کھانا کھلایا۔

بابا خاصے تھکے ہوئے تھے۔ سنگین خان اُنہیں اوپر اپنے بیڈروم سے ملحقہ دوسرے بیڈروم تک لایا۔ ایکبار پھر کمرے میں اور واش روم میں ہر چیز چیک کی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے بستر میں لیٹے۔ اُسے لائیٹ آف کرنے کو کہا۔ اُس نے لائیٹ آف کی۔ اُنہیں 'شب بخیر' کہا۔ اور —

باہر نکل کر دروازہ بند کرتے ہوئے اپنے بیڈروم میں آ گیا۔

کپڑے تبدیل کر کے نائیٹ سوٹ پہنتے ہوئے وہ اپنی بالکنی میں نکل آیا۔

غیر متوقع اُس نے دیکھا۔ ڈاکٹر ضیاء تیز تیز واک کر رہا تھا۔

''خیریت ڈاکٹر صاحب؟'' اُس نے اوپر سے آواز دی۔

''یار فہد نے اتنا ہیوی کھانا کھلایا ہے۔ وہی ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''میں بھی آتا ہوں۔'' سنگین خان نے کہا۔ اور —

اندر آ کر نائیٹ سوٹ پر ہاف لینتھ گاؤن لیتے ہوئے نیچے اور پھر باہر چلا آیا۔

دونوں گپ شپ کرتے واک کرنے لگے۔

''یار کتنا ہیوی کھانا کھاتے ہیں یہ لوگ۔'' ڈاکٹر ضیاء بولا۔

''جبھی تو اس عمر میں بھی اتنا بڑا پیٹ نکلا ہوا ہے۔'' سنگین خان مسکراتے ہوئے بولا۔

''حالانکہ میں منع بھی کرتا ہوں۔ لیکن ---''

''اِس کی گرل فرینڈ کو کتنی مشکل ہوتی ہوگی ---''

''کیا مطلب؟''

''یار اس کو لپٹنے میں اور کیا؟''

ڈاکٹر کا بے اختیار قہقہہ گونجا۔

''تمہیں پتہ ہے۔'' اچانک ڈاکٹر نے پٹڑی بدلی۔

''کیا؟''

''میں نے پتہ لگا لیا ہے۔ کہ زیب پاکستان میں کہاں رہتی ہے؟''

''اچھا؟''

آج پہلی بار وہ زیب کے ذکر سے چڑا نہیں۔ کیونکہ اُسے پتہ تھا۔ زیب کا اُس کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ نائلہ کے ہاتھوں بیوقوف بن رہا تھا۔

''ہاں۔ وہ خود تو نہیں بتا رہی تھی۔ میں نے بہتیرا پوچھا۔ مگر ٹال جاتی تھی۔ یہ تو آج وہ لڑکا میرے پاس پیشنٹ کی حیثیت سے آیا تھا۔ جو تمہیں یاد ہے فارمز پر بھی تھا اُس کے ساتھ۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ باتوں باتوں میں مَیں نے اُس سے پوچھ لیا۔ کہ پاکستان میں وہ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ بس اُس نے بتا دیا۔ --''

''اوہ۔'' اِس وقت پھر اُسے اچھا نہیں لگا۔

کیا ڈاکٹر کو اُس کے چہرے سے اُس کا ردِ عمل پتہ نہیں چلتا تھا؟ اس معاملے میں شاید کورا تھا!

یہی تو وجہ تھی کہ اُس نے اچانک بابا کو بلوا لیا تھا۔ زیب سے ملوانے اور پھر — اُس کے یہاں اپنا رشتہ بھجوانے!

''ہاں تو — بات ہو رہی تھی فہد کے یہاں کھانے کی۔'' اُس نے خود ہی موضوع بدل دیا۔

''ہاں یار۔'' ڈاکٹر نے بڑی آسانی سے پچھلا موضوع چھوڑ دیا۔ ''پتہ نہیں یہ لوگ اتنا گوشت اور چربیاں کیسے ہضم کر لیتے ہیں؟''

''جبھی تو اتنے پیٹ نکلے ہوتے ہیں۔''

''لگتا ہے full term ہے بچارے کا۔''

سنگین خان کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''میں تو اُسے کہتا بھی ہوں۔ کہ تم بچے کی ماں بننے والے ہو۔''

''اپنے ملک میں تو عبایا پہن کر خود کو کچھ نہ کچھ چھپا لیتے ہیں۔ مگر یہاں مشکل ہے۔ میں نے اُسے کہا ہے۔ برائیٹن آنے سے پہلے خوب جوگنگ کیا کرو۔ تا کہ پیٹ کم ہو۔ سمارٹ نظر آؤ۔ آخر کو تمہاری گرل فرینڈز بھی تو ہوتی ہیں۔'' سنگین خان مزید بولا۔

''ویسے ہے اچھا بندہ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''اِس میں تو کوئی شک نہیں۔''

''پیٹر کل تمہاری بہت تعریف کر رہا تھا۔'' ڈاکٹر بولا۔

''ایک تمہاری ہی کوئی تعریف نہیں کرتا۔ پتہ نہیں کیوں؟''

ڈاکٹر کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔

یوں ہی گپ شپ کرتے دونوں اپنے گھروں کے آگے واک کرتے رہے۔

''اب چلنا چاہیے۔ بابا صبح جلدی جاگ جاتے ہیں۔ مجھے بھی اٹھنا ہوگا۔''

جبکہ آج کل ایکبار پھر وہ خود بھی زیب کی کال پر صبح صبح ہی جاگ پڑتا تھا:

''ہاں۔ اب چلنا چاہیے۔ رات بھی بہت ہو گئی ہے۔ او کے۔ گڈ نائیٹ۔'' ڈاکٹر جانے لگا۔

''گڈ نائیٹ۔'' سنگین خان اپنے دروازے کے پاس ہی تھا۔ اندر جاتے جاتے بولا۔

کوئی کھٹکا کیے بغیر دروازہ بند کیا۔ کہ بابا ڈسٹرب نہ ہوں۔ اور پھر دبے قدموں اوپر اپنے بیڈروم میں جانے لگا۔

صبح زیب کی کال پر وہ جاگا۔ واش روم گیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ نماز پڑھی۔ اور نیچے آ گیا۔

بابا کی عادت تھی۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کچھ دیر مزید سو لیا کرتے تھے۔ وہ خاموشی سے کچن میں گیا۔ اپنے لیے بیڈ بنائی۔ اور—

اوپر اپنی بالکنی میں آ کر بیٹھ گیا۔

حسبِ معمول سمندر، ساحل اور ارد گرد پر دُھند چھائی ہوئی تھی۔ گہری دُھند میں سے بمشکل نظر آتے درختوں کی ہریالی اور خوبصورت ڈھلانی چھتوں والے گھروں کے دھندلے عکس ہمیشہ کی طرح انوکھا حسن لیے تھے۔

محظوظ ہوتا وہ اپنی چائے پی رہا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے اپنے سیل فون پر زیب کا نمبر ملا لیا۔

''زیب بابا آئے ہیں۔'' وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''سچ؟''

''ہاں۔''

''آپ نے پہلے کوئی ذکر نہیں کیا۔''

''بس — میں نے اچانک بلوالیا تھا۔تم سے ملوانے۔۔۔''

''میں۔۔۔میں کیسے ملوں گی؟'' وہ گھبرا ہی تو گئی۔

''جیسے سب لوگ ملتے ہیں۔''

''لو۔۔۔گوں۔۔۔کی تو اور بات ہے۔۔۔''

''تم اتنی گھبرا کیوں گئی ہو؟''

''سنگین آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''کیا؟''

''کہ بابا آئے ہیں۔اور میں اُن سے ملوں گی؟''

وہ ہنس دیا۔دلآویزی سے۔اُس پر پیار بھی بہت آیا۔کتنی چھوئی موئی سی تھی۔

''بابا صرف اور صرف تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔میں نے بلوایا ہے۔''

''ہائے۔میں کیسے ملوں گی؟''

''مل لوگی۔اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

''بہت بڑی بات ہے۔بہت مشکل بات ہے۔''

وہ مسکرا دیا۔دھیرے سے۔

''آپ ہنس رہے ہیں۔میں گر گئی تو؟''

اُس کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔پھر فوراً خیال آیا۔بابا نہ جاگ جائیں۔مگر خیریت گزری۔ بالکنی کا۔اُس کے بیڈروم کا اور بابا کا بھی دروازہ بند تھا۔

''میں ہوں نا تمہیں تھامنے کے لیے۔''

''آپ نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔''

''تمہارا کہیں رشتہ ہوگا۔تو تمہیں کوئی دیکھنے نہیں آئے گا؟''

''وہ تو۔۔۔عورتیں آتی ہیں نا۔''

''میری — نہ ماں ہے — نہ بہن۔'' اچانک اُس کے لہجے میں کرب اُتر آیا تھا۔

''اوہ۔''

اُس نے کبھی زیب کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔وہ بھی دکھی ہوگئی۔بے حساب!

''بابا صرف تین دن کے لیے آئے ہیں۔آج تم سے ملنا چاہیں گے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' اُسے ماننا پڑا۔کہ وہ اُس کی آواز میں دکھ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

''لیکن کہاں ملوں گی؟''

''میرے گھر پر۔''

''میں۔۔۔آپ کے گھر آؤں گی؟''

''ہاں۔''

''نہیں سنگین۔یہ بابا کو بھی اچھا نہیں لگے گا۔''

''اچھا چلو۔تینوں اکھٹے کسی ریسٹورانٹ میں لنچ کرلیں گے۔''

''وہ چپ رہی۔فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ہچکچا رہی تھی اب بھی!

اُس نے گہری سانس لی۔قدرے سوچا۔

''چلو یہ بھی رہنے دو۔تم یوں کرو۔کہ اپنے قریب والے بس سٹاپ پر آجاؤ۔میں نے بابا کو نہیں بتایا ہوگا کہ تم زیب ہو۔بس یوں ظاہر کروں گا۔کہ تمہیں ٹاؤن سینٹر تک لفٹ دے رہا ہوں۔اس طرح وہ تمہیں دیکھ لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اب یہ تجویز تو وہ رد نہیں کرسکتی تھی نا۔

اُس نے فون بند کردیا۔دھیرے سے مسکرایا۔اُس کی مسکراہٹ میں شرارت تھی۔شوخی بھی!

گیارہ بج رہے تھے جب وہ بابا کو لیے گھر سے نکلا۔

کُہر چھٹ چکی تھی۔ ہوائیں بھیگی بھیگی اور — نیلے گگن تلے پھولوں اور پانیوں کی مہک مستی لُٹا رہی تھی۔

جلدی ہی اُس نے دیکھا۔ زیب بس سٹاپ پر آئی کھڑی تھی۔

''بابا۔ وہ زیب کھڑی ہے۔'' اُس نے سامنے بائیں طرف بس سٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بابا کو بہت بتا چکا تھا۔ کہ کس طرح وہ اُن کے گھر آنے سے گھبرا رہی تھی۔ کسی ریسٹورانٹ میں کھانے سے کترا رہی تھی۔ اور کس طرح بڑی مشکل سے اُس نے اُسے بس سٹاپ سے سٹی سینٹر تک لے جانے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ بھی اِس شرط پر کہ بابا کو یہ معلوم نہیں ہوگا۔ کہ وہ ہی زیب تھی!

اِس کے باوجود سنگین خان نے اُسے بٹھانے کو گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ تو وہ کانوں تک سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ کہ اُسے تو معلوم تھا کہ وہ بابا ہی تھے۔

بہر حال — سر پر دوپٹہ لیے نظریں جھکائے اُس نے بہت ادب سے بابا کو سلام کیا۔

کہ —

اُن کی عمر کا تقاضا تھا۔ اُن کے رتبے کی ڈیمانڈ تھی!

جانے کیوں؟ وہ بابا کو بہت اچھی لگی۔ دل نے کہا۔ یہی وہ لڑکی ہے جس کی اُنہیں سنگین خان کے لیے تلاش تھی!

سنگین خان نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

''بابا کہاں چلیں؟ اُس نے آرام سے بابا سے دریافت کیا۔

''East Bourne چلو بیٹا۔ وہیں پب سے کھانا پیک کروالیں گے۔ اور قریب ہی دوسری طرف سی سائیڈ پر پکنک منالیں گے۔''

دونوں یوں بول رہے تھے۔ جیسے پہلے ہی اچھا خاصا پکنک کا پروگرام بنا کر چلے تھے گھر سے!

سنگین خان نے بابا کی نظریں بچا کر ریو مرر میں سے زیب کو دیکھا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔ خشمگیں نظروں سے!

باپ رے — بے ساختہ آئی ہنسی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اُس نے نظریں سامنے سڑک پر جمادیں۔

ایسٹ بورن آبادی سے خاصا دور تھا۔ پتلی بل کھاتی سڑک پر وہ چلتا چلا گیا۔

''بیٹی۔ برائیٹن کیسا لگا؟'' بابا نے ہی ابتداء کی۔

''جی۔ بہت پیاری جگہ ہے۔'' اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔ اور —

ایکبار پھر سنگین خان پر غصہ آنے لگا۔ کہ وہ اتنا سارا وقت بابا کے سامنے کیسے گزارے گی؟

بہر حال — سنگین خان کے پب سے کھانا لینے اور واپس آنے تک بابا اُس کے ساتھ خاصی دوستی بنا چکے تھے۔ وہ سچ مچ اِس قابل ہوگئی تھی۔ کہ اُن کے ساتھ پکنک منا سکے۔ اور یہی بابا کی منشا تھی۔ کیونکہ وہ محسوس کر چکے تھے۔ کہ اُن کی موجودگی میں وہ اِیزی فیل نہیں کر رہی تھی۔ اور —

ایسا ہونا قدرتی تھا۔ وہ سنگین خان کو پسند کرتی تھی۔ اور آج سنگین خان کے والد اُسے جانچنے آئے تھے۔ اُس کی جھجک وہ بخوبی سمجھ رہے تھے۔

اُنہیں وہ پسند سے پسندتر آ رہی تھی۔ حیا تھی اُس میں۔ بڑوں کا لحاظ کرنا آتا تھا۔ اور — بہت بہت خوبصورت تھی۔

پکنک سپاٹ قریب ہی تھا۔ اُس نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔

سنگین خان اور زیب سامان نکالنے لگے۔ بابا یوں ہی آس پاس نظریں دوڑانے لگے۔ سمندر کا ساحل تھا۔ اور بھی لوگ پکنک پر آئے انجوئے کر رہے تھے۔

سنگین خان نے ایک طرف rug بچھایا۔ زیب باقی چیزیں رکھنے میں برابر مدد کرتی رہی۔

"How do you feel?" سنگین خان نے دھیرے سے پوچھا۔

''میں سخت نروس ہوں۔ دیکھ لوں گی بعد میں آپ کو۔'' وہ بھی بالکل ہولے سے بولی۔

''میں بعد میں ملوں گا ہی نہیں۔ کہیں چھپ جاؤں گا۔''

''چھپ کر تو دیکھیں۔۔۔''

''کیا کر لو گی؟''

''چپ کریں۔ بابا دیکھ رہے ہیں۔'' زیب نے کہا۔

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ بابا پرلی طرف کھڑی لوہے کے مضبوط جنگلے کے اُس پار پانیوں پر نظریں جمائے تھے۔

''جھوٹ بھی بولتی ہو؟''

''آپ سے سیکھا ہے۔''

''میں کب جھوٹ بولتا ہوں؟''

''آج کا سارا پروگرام۔۔۔''

اور— خیال آتے ہی وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ واقعی آج اُس نے اُسے صرف سٹی سینٹر تک ساتھ دینے کو کہا تھا۔ اور یہ بھی کہ بابا کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ ہی زیب تھی!

''بابا مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔ آپ سے بھی زیادہ۔۔۔''

''دیکھو۔ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔ بابا ویسے بھی حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔''

وہ بے اختیار ہنس دی۔ کچھ بھی بول دیتا تھا وہ!

سب تیار کر کے اُنہوں نے بابا کو بلالیا۔

تینوں بیٹھ گئے۔ زیب نے بابا کے آگے پیپر پلیٹ رکھ دیا۔ کھانے کی چیزیں اُنہیں سرو کرنے لگی۔ سنگین خان اپنے آگے پلیٹ رکھ چکا تھا۔ بابا کے بعد وہ سنگین خان کو پیکٹس کھول کھول کر پیش کرنے لگی۔

بابا نے دیکھا۔ اِس تمام دوران وہ سر پر دوپٹہ لیے تھی۔ نظریں اوپر اُٹھتی ہی نہیں تھیں۔ چہرے پر حیا کی لالی دوڑ رہی تھی۔ ضرورت پڑنے پر اُن سے بہت مؤدب بہت مہذب طریقے سے بات کرتی۔ سنگین خان کے ساتھ تو اُن کے سامنے بات کر ہی نہیں رہی تھی۔

کیا تربیت کی تھی ماں نے۔ وہ داد دیئے بنا نہ رہ سکے۔

اور — کیا دل کھول کر اور جی بھر کر حسن بخشا تھا بنانے والے نے!

آخر میں اُس نے بھی اپنی پلیٹ میں کھانا لیا۔ دھیرے دھیرے کھانے لگی— وہی نظریں جھکیں جھکیں پلکیں گریں گریں!

بابا دل ہی دل میں سنگین خان کی پسند کو سراہ رہے تھے!

وہ کھانا کھا رہی تھی۔ مگر اُن کی برابر فکر لگی تھی۔ بار بار مزید پوچھتی۔ مزید چیزیں آفر

کرتی۔

ایسے میں چپکے سے سنگین خان کے آگے بھی کھانے کی چیزیں کھسکا دیتی۔

اُس کا ہر انداز اُن کے دل میں گھر کر رہا تھا!

وہ سنگین خان کی چوائس کی من ہی من میں داد دے رہے تھے!

اور— بہت جلدی ہی اُنہوں نے سنگین خان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اُنہیں بس زیب جیسی ہی بہو چاہیے تھی!

پکنک کے بعد وہ لوگ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے واپس روانہ ہوگئے۔

''بیٹا ہمیں گھر پر اتار دو۔ تم زیب بیٹی کو گھر پہنچا دو۔ ہم خاصے تھکے ہوئے ہیں۔ آرام کریں گے۔'' گھر قریب آتے ہی بابا بولے۔

اُنہوں نے واقعی اتنے لمبے سفر کے بعد مناسب آرام نہیں کیا تھا۔ آتے ہی سارا دن سنگین خان کے دوستوں کے یہاں دعوتوں میں گزار دیا تھا۔ رات کچھ سوئے تھے۔ مگر وہ دوپہر کو آرام کرنے کے عادی تھے۔ تھوڑا استا لیتے تو فریش ہو جاتے۔

''جی بابا۔'' سنگین خان نے مؤدب طریق سے کہا۔

بابا کو گھر پر اتارنے کے بعد وہ گاڑی دوبارہ ہاربر سٹریٹ میں لے آیا۔

''آگے آجاؤ میم صاحب۔'' تھوڑا سا ہی آگے جانے کے بعد اُس نے گاڑی روکتے ہوئے ہنوز پیچھے بیٹھی زیب سے کہا۔

''یہیں ٹھیک ہے سَر۔''

''آؤ نا۔'' اُس نے رخ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟''

اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''اتنی دیر بعد یاد آیا۔''

''میں تو ایک ایک منٹ گن رہی تھی۔ کہ کب آپ اکیلے ملیں اور کب میں۔۔۔'' وہ دانستہ چپ ہوگئی۔

''مجھے دیکھ لوگی۔'' اُس نے اُسی کی بات دہرائی۔

''ہاں'' وہ دلآویزی سے ہنس دی۔

''تو— آگے آ کر کرو نا جو کچھ کرنا ہے۔''

اور— وہ دروازہ کھولتے ہوئے آگے آ کر اُس کے ساتھ پیسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔

سنگین خان نے گاڑی چلا دی۔

''بولو۔ کیا کرنا ہے میرے ساتھ۔'' اُس نے خود کو آفر کیا۔

اُس نے دھیرے سے اپنا سر اُس کے کندھے پر ٹکا دیا۔

''آپ کو پتہ ہے میں آپ کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتی۔۔۔''

سنگین خان نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ بے اختیار اُسے پیار کرنے لگا۔

"I can't live without you Zeb mine. You are mine.
"Say you are may own." ہولے ہولے سرگوشیاں کرتی اُس کی آواز جذباتی ہو رہی تھی۔

زیب اُس کی بے ترتیب سانسوں، مدھر سرگوشیوں میں کھو گئی تھی۔ گم ہو گئی تھی!

کتنے ہی پل یوں ہی گزر گئے۔ ہوش کی دنیا میں آئی۔ اٹھ کر بیٹھی۔ سامنے دیکھا۔

''آپ۔۔۔'' کہاں جا رہے ہیں۔ میرا گھر تو پیچھے رہ گیا۔'' وہ پریشان سی بولی۔

''بس آدھا گھنٹہ اور۔'' اُس نے ریکویسٹ کی۔ کہ—

وہ جان بوجھ کر ایک سنسان راستے پر ہو لیا تھا۔

''آپ پہلے کبھی ایسا کرتے۔ تو ڈر سے میری جان نکل جاتی۔''

اُسے شروع کے دن یاد آئے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر چونک چونک جاتی تھی۔ گھبرا گھبرا جاتی تھی!

''چلو۔ تم نے مجھ پر ٹرسٹ تو کیا۔''

وہ چند پل خاموش رہی۔

''پتہ نہیں بابا میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ کہ کیسی لڑکی ہے۔ جان نہ پہچان

اُن کے جوان بیٹے کی موجودگی میں چلی آئی۔۔۔''

''تو وہ تمہیں اپنے جوان بیٹے کے لیے ہی تو دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنے لیے تو ظاہر ہے۔۔۔'' اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

زیب نے اُسے پیٹ ڈالا۔

وہ اُس کے نازک وار سہتا، ہنستا رہا— دلکش، دلنشیں ہنسی!

''ویسے — جب تم کام میں مصروف ہوتی تھیں۔ میں نے نوٹ کیا تھا۔ بابا تمہیں بہت غور سے دیکھ رہے ہوتے تھے۔ اتنے غور سے کہ میں ڈر گیا۔۔۔''

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ— وہ تمہیں میرے بجائے اپنے لیے نہ پسند کر لیں۔۔۔''

''پھر؟'' اُس نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

''تم اتنی خوبصورت ہو۔'' وہ ذرا بھی اثر لیے بغیر کہنے لگا۔'' کیا پتہ کب کسی کا دل بے ایمان ہو جائے۔''

''پلیز! آپ میرے بابا کے لیے ایسا مت کہیں۔''

''او واؤ — مجھے پتہ ہے تم اُن کے ساتھ مل کر میرے خلاف محاذ قائم کرو گی۔''

''ایسا تو ہوگا۔ آپ ابھی سے سوچ لیں۔''

''سوچ چکا ہوں میں۔ میں کوئی ایسی ٹرک کروں گا کہ بابا اور تم دونوں میرے ہی حق میں ہو جاؤ گے۔''

وہ ہنسنے لگی۔ دور کہیں پریوں کے دیس میں بجتی گھنٹیوں کی سی ہنسی۔

پل بھر کو وہ دم بخود سا اُسے دیکھتا رہا۔

''ایسا کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''سوچ رہا ہوں۔ کہ میں تمہیں کیسے چھپاؤں گا؟ کس کس سے چھپاؤں گا؟''

''کیوں؟''

''بس — میں نہیں چاہتا۔ کہ تمہیں کوئی اور دیکھے۔ کوئی اور سنے۔''

''اور۔۔۔ یہی بات میں کہوں تو؟''

''I'm your's now. مجھے اور کوئی نہیں دیکھے گا۔''

''آپ بھی مجھے اپنے دل میں چھپالیں۔ جہاں نہ مجھے کوئی دیکھ سکے۔ نہ سن سکے۔''

ایکبار پھر— وہ اُسے پیار کرنے لگا۔

آدھا گھنٹہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ وہ اُسے اُس کے گھر کی طرف لے جانے لگا۔ اُسے بابا کی بھی فکر تھی۔ کہیں یہ نہ سوچنے لگتے۔ کہ وہ زیب کو لیے کہاں نکل گیا؟

اُسے اُس کے گھر سے قدرے فاصلے پر اُسی مخصوص جگہ پر اتار کر— وہ چلتا بنا۔

رات ڈنر کے بعد سنگین خان نے اپنے اور بابا کے لیے کوفی بنائی۔ اور دونوں بابا کی بالکنی میں آکر بیٹھتے ہوئے آس پاس کے enchanting ماحول سے لطف اندوز ہوتے مزیدار کوفی پینے لگے۔

بابا زیادہ تر زیب کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

''بیٹے وقت بہت بدل گیا ہے۔ مگر اِس لڑکی کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے اِن کے یہاں وقت تھم گیا ہے۔ اچھے وقتوں کی طرح بڑوں کے سامنے سر ڈھک لینا، نظریں جھکائے رکھنا، مؤدب طریقے سے بات کرنا— یہ تو اب خواب سا بن گیا ہے۔ اب تو بعض لڑکیوں کو دیکھ کر خود کو embarrassment ہونے لگتی ہے۔۔۔''

سنگین خان زیب کی تعریفیں سن سن کر خوش ہو رہا تھا۔

''وہ واقعی اچھی لڑکی ہے بابا۔ اُس میں اور بھی بہت سی qualities ہیں۔''

''بتاؤ نا۔ ذرا ہم بھی تو سنیں۔'' بابا اچانک دوست بن گئے۔ اُس کی طرف جھکتے ہوئے قدرے رازداری سے پوچھنے لگے۔

سنگین خان بلش سا ہوا۔ پھر— ہنس دیا۔ خوشگواری سے

''بس بہت اچھی ہے بابا۔''

"It seems you are in love with her. Aren't you?" وہ اُسے بغور دیکھتے

ہوئے بولے۔

''یس بابا۔'' اُسے بابا کے انداز پر ہنسی بھی آئی۔ ''آپ کو کیسی لگی؟''

''بیٹا وہ تو ہمارے دل میں بس گئی ہے۔'' وہ سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔

''correction بابا۔ وہ میرے دل میں بسی ہے۔''

''اوہ — سوری۔ لیکن ہم کیا کہیں گے کہ وہ ہمارے یہاں کہاں رہتی ہے؟''

''آپ کے بھی دل میں رہتی ہے۔'' سنگین خان بہت محبت سے بولا۔

''یہ ہوئی نا بات۔'' خوشگواری سے ہنستے ہوئے حسبِ عادت بابا نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

سنگین خان نے اپنا دل ٹٹولا۔ کتنی محبت کرتا تھا وہ اپنے بابا سے؟ کتنی عقیدت تھی اُسے اپنے بابا سے؟ بحرِ بیکراں تھا ایک وہاں بابا سے محبت کا، بابا سے عقیدت کا۔

اُسے یقین ہو گیا۔ اُس کے بابا جیسا کوئی نہیں تھا!

''جاتے ہی تمہارے لیے پیچھے اینیکسی بنوانا شروع کرتے ہیں۔۔۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی شادی کے بعد تم اور تمہاری بیوی رہو گے نا اُس میں۔''

''کیوں بابا۔ اپنا گھر کم پڑتا ہے؟''

بابا کی زبانی سنگین خان کا نائلہ سے شادی سے انکار کا سن کر مما واپس اپنی اینیکسی میں چلی گئی تھیں۔ اور اپنی کوٹھی تو اتنی وسیع و عریض تھی۔ کہ چلتے پھرتے بھی تھک جاؤ۔ وہیں اُس کا اپنا سویٹ بھی تھا۔ پھر بھی بابا اینیکسی کی بات کر رہے تھے!

''نہیں لیکن۔۔۔ پھر بھی۔''

''بالکل نہیں۔ ہم اکٹھے رہیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟''

''چلو دن کو تم لوگ ہمارے پاس رہو۔ رات کو اپنی اینیکسی میں چلے جایا کرو۔''

''رات کو بھی کیوں؟''

''پرائیویسی بیٹا پرائیویسی۔'' بابا اُسے ایک ونک دیتے ہوئے بولے۔

اور — سنگین خان نے گہری سانس لی۔

''بس بابا۔ آپ زیادہ رومینٹک نہ ہوں۔ میرے بچے ہر وقت اینیکسی سے گھر تک کا سفر نہیں کر سکتے۔''

''او مائی گوڈ! تمہارے بچے — یعنی ہمارے گرینڈ چلڈرن۔ نو۔ نو۔ ہم اُن کو اپنے سے دور نہیں کر سکتے۔ ہم اکٹھے رہیں گے۔ ہم اور ہمارے پوتے پوتیاں ہمارے ہی بیڈ روم میں ہمارے ساتھ رہیں گے۔ تم اور تمہاری بیوی چاہے کسی بھی بیڈ روم میں رہو۔ یہ طے ہے۔۔۔''

''اب آئی نا سمجھ؟'' سنگین خان نے کہا۔

''ہاں بیٹا۔ ہم بالکل سمجھ گئے۔'' اُنہوں نے خالی کپ میز پر رکھا۔ اور—

سنگین خان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کے ماتھے پر شفقت بھرا بوسہ دیا۔ تو سنگین خان چونکا۔ اُن کی آنکھیں نم تھیں۔

''یہ کیا بابا؟''

''خوشی کے آنسو ہیں بیٹا۔'' وہ جذباتی ہو رہے تھے۔ ''بس جلدی شادی کرو۔ اور ہمیں ہمارے پوتے پوتیاں دو۔''

اُس نے اُن کے آنسو اپنی انگلیوں پر اٹھا لیے۔

''بس یوں شادی کی۔ اور یوں پوتے آ گئے آپ کے بابا۔'' اُس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

بابا خوش ہو گئے۔ ایکبار پھر اُس کا ماتھا چوما۔

''خوش رہو بابا کی جان۔''

کچھ دیر یوں ہی باپ بیٹا گپ شپ کرتے رہے۔ پھر—

دونوں کمرے میں آ گئے۔ حسبِ معمول سنگین خان نے بابا کا بستر، جگ میں پانی اور واش روم وغیرہ چیک کیا۔ پھر اُن سے اجازت لی۔ اور—

'شب بخیر' کہتا ہوا اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔

زیب کا رزلٹ آ گیا تھا۔ بہت اچھے مارکس آئے تھے اُس کے۔ امی نے فون کر کے اُسے بتایا تھا۔ یہ بھی۔ کہ اُسے واپس آنے کی تیاری کرنی چاہیے تھی۔ ایم۔اے میں ایڈمشنز شروع ہونے والے تھے۔

جہاں اُسے اپنے پاس ہونے کی خوش ہوئی تھی۔ وہاں برائیٹن چھوڑ دینے کا سن کر سخت پریشان ہوگئی تھی۔ برائیٹن بہت خوبصورت سی سائیڈ سٹی تھی یہ حقیقت اپنی جگہ تھی۔ خالہ اور بچے سب کے ساتھ بہت محبت اور خلوص سے وقت گزر رہا تھا۔ یہ بھی صحیح تھا۔ مگر—

سنگین خان کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ یہ سچائی نہایت پریشان کن تھی۔

آگے کیا ہونے والا تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ جانتا تھا۔ گرچہ سنگین خان کی محبت کا بھی اُسے یقین

آ گیا تھا۔ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی وہ مانتی تھی لیکن—

الگ تو اُنہوں نے ہونا تھا۔ چاہے عارضی سہی۔

اور— وہ یہ عارضی جدائی بھی برداشت نہ کر پا رہی تھی۔ اُس کی محبت اُس کی زندگی بن گئی تھی۔ اور زندگی کے بغیر وہ کیسے جی سکتی تھی؟ پچھلے دنوں جب اُسے نائلہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اور بیوفا سمجھی تھی۔ وہ تو تب ہی سمجھ گئی تھی۔ کہ وہ اُس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ جبھی تو انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ بہت ساری سلیپنگ پلز اکھٹی نگل لی تھیں۔

اپنی کامیابی کا سنا تھا۔ پھر بھی اُداس ہوگئی تھی۔ گھر میں اکیلی تھی۔ انکل اپنے آفس، آصفہ اور کاشف یونیورسٹی اور نازیہ خالہ ہوسپٹل چیک اَپ کے لیے گئی تھیں۔

یوں ہی چلتے چلتے وہ پچھلے طرف لان میں نکل آئی۔ بینچ پر بیٹھی۔ تو سب سے پہلے اپنے پاس ہونے کی خبر سنگین خان کو دیدی۔

"Good— congratulations"۔

''تھینک یو۔''

''اتنی اُداس کیوں ہو؟'' وہ اُس کی آواز سے ہی سمجھ گیا۔

''واپس بھی تو جانا پڑے گا نا سَر۔''

''کیوں؟'' وہ بے اختیار بولا۔ ورنہ—

وہ بھی جانتا تھا کہ وہ رزلٹ آؤٹ ہونے تک ہی یہاں تھی!

''ایم۔اے میں ایڈمشنز ہونے والے ہیں۔۔۔''

''اوہ — لیکن تم ایڈمشن مت لونا۔ کیا ضرورت ہے۔ آدھے میں چھوڑنا پڑے گا۔۔۔''

''ایڈمشن تو لینا ہے۔''

''یار میں بھی واپس جا رہا ہوں۔ بس پہلے ذرا ہالینڈ جانا ہے۔ بزنس کے سلسلے میں۔ اُس کے بعد سیدھا پاکستان جاؤں گا۔ پھر بابا تمہاری فیملی سے ملیں گے۔ ہماری شادی کی بات کریں گے۔ اور میں دو سال تک تو انتظار نہیں کروں گا۔۔۔''

''میں امی ابو کو تو یہ سب نہیں بتا سکتی نا۔''

''اچھا تم پریشان نہ ہو۔ بے شک جاؤ۔ ایڈمشن بھی لے لو۔ ایک دو کام وائینڈ اَپ کر کے میں بھی آ جاؤں گا۔ باقی سب وہیں طے کر لیں گے۔ ایم۔ اے تم شادی کے بعد بھی پورا کر سکتی ہو۔'' اُس نے اُسے تسلی دی۔

مگر— زیب کا دل جیسے بھینچ رہا تھا کوئی مٹھی میں۔

''یہاں تو ہم مل لیتے ہیں۔ وہاں تو یہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔'' وہ بہت اُداس ہو رہی تھی۔

''تم دیکھتی رہو میں کیسے ملتا ہوں تمہیں۔۔۔'' وہ اُس کا دھیان بٹانے کو خوشگواری سے بولا۔ ''ویسے تم اِس وقت مل سکتی ہو مجھے؟''

''نہیں۔ گھر بالکل اکیلا ہے۔''

''یہاں پاکستان کی طرح چوریاں تھوڑی ہوتی ہیں۔ آ جاؤ۔''

''خالہ بھی گھر پر نہیں ہیں۔ بُرا لگتا ہے۔''

''او کے فائین۔ کل پھر وقت نکالو۔''

''ٹھیک ہے۔''

کچھ دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ وہ بھی قدرے بہل گئی۔ فون بند کیا۔ تو—

آصفہ کو اپنے پاس ہونے کی خوشخبری سنائی۔

اِسی خوشی میں سب نے برائیٹن مرینہ میں "The pagoda restuarant" میں چائینیز ڈنر کھایا۔ سبھی خوش تھے۔ ہاں —

زیب پر گاہے گاہے اُداسی چھا جاتی!

آصفہ سمجھ رہی تھی وہ کیوں اُداس تھی۔ اُسے وہ لوگ بھی یاد آ رہے تھے اور — سنگین خان بھی۔ اُداس تو ہونا تھا۔ بہرحال —

رات دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ آصفہ کی بھی تو دسمبر میں ابرار احمد سے شادی طے پا گئی تھی۔ وہ لوگ بھی شادی سے ہفتہ دس دن پہلے پاکستان آنے والے تھے۔ اِس کی بھی دونوں کو بہت خوشی تھی۔ تب تک زیب کی بھی سنگین خان کے ساتھ بات پکی ہو جاتی تھی۔

''دس دن پہلے نہیں۔ ایک مہینہ پہلے آ جاؤ۔ پھر تو شادی ہو جائے گی۔ جانے کب ملاقات

ہو۔'' زیب نے آصفہ سے کہا۔

''ایک مہینہ پہلے کیسے آ سکتی ہوں۔ فائنل ایئر ہوگا تب تو پڑھائی ہی پڑھائی ہوگی۔ شادی میں الگ چھٹیاں کرنی پڑیں گی۔ ابرار سے کہا بھی۔ کہ فائنل ایئر کرنے دو۔ مگر۔۔۔'' مسکراتے ہوئے اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا ہوگا نا۔'' زیب بھی مسکرا دی۔

''ہاں۔ بس یہی سمجھو۔''

''ویسے یہ اچھا ہے۔ کہ رہو گے تم دونوں برائیٹن میں ہی۔ خالہ خالو بھی قریب ہوں گے۔ اور ابرار بھی اپنے پیرنٹس کے نزدیک ہوگا۔''

''ہاں۔ رہیں گے تو انشاء اللہ یہیں پر ہی۔'' آصفہ نے کہا۔

''میرے لیے بھی دعا کرو آصفہ۔ پتہ نہیں کیوں؟ دل پریشان سا ہے۔ کچھ ویسے بھی بڑے لوگوں کے وعدوں پر کوئی خاص اعتبار نہیں ہے۔ جانے کیوں؟ بس۔۔۔ الجھی ہوئی ہوں سخت۔ کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔'' کہتے کہتے وہ رو دی۔

''زیب رو کیوں رہی ہو؟'' آصفہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''زینیہ یاد آ گئی ہے۔'' وہ مزید رو دی۔

آصفہ اپنے میٹرلیس سے اٹھتے ہوئے اُس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اُس کا سر اپنے گود میں رکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی اِس وقت اُسے زینیہ کیوں یاد آ گئی۔ اُسے کسی طور کسی امیر لڑکے کی کسی معمولی طبقے کی لڑکی سے محبت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ زینیہ کا ایسا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ کہ امیر طبقے سے ہی ایمان اُٹھ گیا تھا۔ اُس لڑکے نے جو زینیہ کو مڈل کلاس لڑکی کا طعنہ دیا تھا۔ وہ کسی طور اُسے بھول نہیں پا رہی تھی۔

''اللہ سب بہتر کرے گا انشاء اللہ۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم خوشی خوشی جاؤ۔ ایڈمشن لو ایم۔ اے میں۔ اور۔۔۔ سنگین خان کے بارے میں بُرے خیالات ذہن میں مت لاؤ۔ ہر آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ وہ بُرا آدمی نہیں لگتا۔ سب ٹھیک ہوگا اللہ نے چاہا تو۔'' وہ اُس کے بال سہلاتے ہوئے پیار سے کہہ رہی تھی۔

''تھینک یُو آصفہ۔'' اُس نے محبت سے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''میں نے تمہیں

پریشان کر دیا۔ بس اب سو جاؤ تم بھی۔

آصفہ اپنے بستر پر آ گئی اور——

زیب دیر تک جاگتی رہی۔ سنگین خان کو ہی سوچتی رہی۔ کبھی اچھا نظر آتا — کبھی بدگمان ہونے لگتی!

زیب پاکستان آ چکی تھی۔ جہاں امی ابو سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہاں — سنگین خان کو ہزاروں میل پیچھے چھوڑ آنے پر کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔

اُس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ہسٹری اُس کا فیورٹ سبجیکٹ تھا۔ اُس میں ایڈمشن کروالیا تھا۔

روزانہ وقت پر یونیورسٹی جانا، کلاسز اٹینڈ کرنا، پرانی اور نئی دوستوں سے ملنا ملانا——وہ کافی حد تک بہل گئی تھی۔ پھر——

سنگین خان بھی تو باقاعدگی سے اُسے کال کرتا تھا۔ میسجز کرتا تھا۔ وہ جی اٹھی تھی ایکبار پھر!

سنگین خان مہینہ بھر کے لیے مزید وہاں رک گیا تھا۔ ہالینڈ آ جا رہا تھا۔ وہی بزنس کے سلسلے

میں لیکن—

وہ اُسے کالز اور میسجز کرکے باقاعدہ اپنے حال احوال سے باخبر رکھتا تھا۔

وہ بھی مصروف ہوگئی تھی۔ سٹڈی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ تھکی تھکائی یونیورسٹی سے واپس گھر آتی۔ تو کھانے پر امی کو منتظر پاتی۔ ابو دوپہر کا کھانا وہیں دکان پر کھالیا کرتے تھے۔ وہ کپڑے تبدیل کرتی اور—

کچن کے قریب برآمدے میں لگی مختصر سی ڈائننگ ٹیبل پر امی کے ساتھ آبیٹھتی۔ امی نے اُس کی پسند کے کھانے میز پر چُنے ہوتے تھے۔ دونوں مل کر کھانا کھاتیں۔ اور— وہ اُنہیں یونیورسٹی میں گزارے دن بھر کے حالات سناتی۔ امی اور زیب میں شروع ہی سے بہت دوستی تھی۔ زینیہ البتہ ابو کی لاڈلی تھی۔ اُن ہی سے زیادہ کلوز تھی۔

حسبِ معمول وہ یونیورسٹی سے آئی۔ کپڑے تبدیل کیے۔ اور کچن میں آگئی۔

''لو بیٹا۔ رکھو میز پر۔'' امی نے اُسے ڈِش پکڑائی۔

پھر خود بھی دوسری ڈِش اور دسترخوان میں لپٹی چپاتیاں لیکر میز پر آگئیں۔

''بھوک لگی ہے امی۔ کیا پکایا ہے؟''

اُس نے ایک ڈِش پر سے ڈھکن اٹھایا۔ بھنڈی گوشت تھی۔ دوسری میں ماش کی دال تھی۔

''واؤ۔'' اُسے بھنڈی گوشت بہت اچھے لگتے تھے۔ پلیٹ میں نکالنے لگی۔

فوزیہ بھی کھانا کھانے لگیں۔ زیب کو گھر پہنچتے پہنچتے ڈھائی بج جاتے تھے۔ کبھی اِس سے بھی دیر ہوجاتی تھی۔ فوزیہ فجر کی نماز کے بعد ایک کپ چائے پیتیں۔ اور فوراً ہی کام میں لگ جاتی تھیں۔ سب سے پہلے کپڑے دھوتی تھیں، فارغ ہوتے ہی زیب کو جگاتیں۔ اور پھر سب کے لیے ناشتہ بنا کر میز پر رکھتیں۔ فیاض احمد، زیب اور فوزیہ مل کر ناشتہ کرتے۔ پھر فیاض صاحب اپنی موٹر بائیک پر دکان اور زیب یونیورسٹی کی بس میں یونیورسٹی چل پڑتی۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد فوزیہ گھر کے کام میں مدد دینے کے لیے رکھے بارہ تیرہ سالہ فضلِ کریم کو ساتھ لگا کر گھر کا باقی کام نمٹاتیں۔

چھ ماہ قبل ہی یہ گھر بنوا کر وہ لوگ اِس میں شفٹ ہوئے تھے۔

گیٹ کے اندر سامنے ایک برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ہی ایک دروازہ ایک چھوٹے سے

ڈرائینگ روم میں کھلتا تھا۔ دوسرا دروازہ ایک بیڈ روم میں۔ جس میں کوئی مہمان وغیرہ آکر ٹھہر سکتا تھا۔ اِن کے پیچھے دو بیڈ رومز تھے۔ ایک فوزیہ اور فیاض صاحب کا، دوسرا زیب کا۔ اِن کے دروازے اندرونی برآمدے میں کھلتے تھے۔ اور وہیں برآمدے کے بائیں سرے پر کچن اور سٹور تھا۔ پھر صحن تھا اور— پچھلی طرف کو کھلتا دروازہ تھا۔

گھر اپنا تھا۔ سر پر چھت اپنی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ہاں یہ خیال اکثر آتا تھا۔ کہ زینیہ کو اِس گھر میں رہنا نصیب نہیں ہوسکا تھا۔ کتنا ارمان تھا اُسے اِس گھر کے مکمل ہونے کا، اِس میں رہنے کا۔ کتنی خوش ہوتی تھی وہ اِس گھر کو بنتے دیکھتے، اِس میں شفٹ ہونے کا سوچتے۔ لیکن ہر خوشی تھوڑی مل جاتی ہے۔ خدا اُن تینوں کو سلامت رکھے۔ اب تو بس یہی دعا تھی اُن سب کی!

اِس وقت تک تھک تھکا کر فوزیہ کو بھی خوب بھوک لگی ہوتی تھی۔ بس زیب کا انتظار رہتا تھا۔

دونوں کھانا کھا رہی تھیں۔ فوزیہ البتہ کسی سوچ میں بھی گم تھیں۔

''امی۔ کچھ بات کریں نا۔ چپ کیوں ہیں؟'' آخر زیب بول ہی پڑی۔

''وہ۔۔۔'' دراصل۔۔۔ آج کسی خاتون کا فون آیا تھا۔ شام چھ بجے ملنے کو آرہی ہیں۔''

''کون خاتون؟'' کھانا کھاتے کھاتے اُس کا ہاتھ رک گیا۔

''کوئی ڈاکٹر ضیاء تھا برائیٹن میں؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''ہاں۔ کیوں؟''

''اُس کی بڑی بہن کا فون آیا تھا۔ شاید تمہیں دیکھنے آرہی ہیں۔''

چند لمحے وہ چپ رہی۔

''آپ سے کہا اُنہوں نے کہ مجھے دیکھنے آرہی ہیں۔''

''ہاں۔ کہتی تھیں اُن کے بھائی نے تمہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔''

اُس نے دھیرے سے کندھے اُچکائے۔ اور کھانا کھانے میں مصروف ہوگئی۔

''کیسا لڑکا ہے وہ؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتہ؟''

"لیکن۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جانتا ہے تمہیں۔" فوزیہ نے کریدنے کی کوشش کی۔

"نہیں امی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل وہ آصفہ کے منگیتر ابرار کا جاننے والا ہے۔ ہم لوگ فروٹ فارمز پر گئے تھے۔ تو وہاں وہ بھی تھا ابرار کے ساتھ۔ وہیں دیکھا تھا اُس نے مجھے۔" زیب نے بہت طریقے سے بات بنائی۔

"اوہ۔ اچھا۔" فوزیہ اتنا ہی بولی۔

اب زیب سوچ میں پڑ گئی۔ پھر — خود ہی مطمئن ہو گئی۔ وہ لوگ ڈاکٹر ضیاء کے شایانِ شان نہیں تھے۔ خود ہی واپس لوٹ جانے تھے!

شام ٹھیک چھ بجے ڈاکٹر ضیاء کی بہن ایک لمبی سیاہ گاڑی میں آ گئیں۔

گاڑی گیٹ پر رُکی۔ تو اُنہوں نے نخوت سے آس پاس نظر ڈالی۔ سب فیاض صاحب کی ہی حیثیت کے لوگ آباد تھے وہاں۔ مڈل کلاس یا پھر اس سے بھی کم۔

ضیاء یا تو شادی سے ہی منکر تھا۔ یا پسند بھی کی لڑکی۔ تو ایسی جگہ میں۔ وہ جو پوش علاقوں اور مرمریں محلوں میں رہتے تھے کیا یہاں اپنے برابر والوں کو لائیں گی؟

فضل کریم نے گیٹ کھولا۔ تو گاڑی اندر آ گئی۔

فوزیہ اُنہیں ریسیو کرنے وہیں کھڑی تھیں۔

ضیاء کی بہن نے گاڑی سے اُتر کر یہاں بھی اِردگرد نظریں دوڑائیں۔ وہی تأثر تھا چہرے پر۔ فوزیہ صاف سمجھ گئیں۔ زیب کی شکل وصورت پہلے بھی دو چار بڑے لوگوں کو دھوکہ دے چکی تھی۔

بہرحال — وہ اُنہیں ڈرائینگ روم میں لے آئیں۔

تھوڑی دیر بعد زیب اُن کے لیے چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔

ضیاء کی بہن نے نظر بھر کر دیکھا۔ تو دل ہی دل میں سراہے بنا نہ رہ پائیں۔ مگر — خیر — اُنہوں نے ایک کپ چائے ضرور لی۔ چند منٹ دونوں ماں بیٹی سے بات بھی کی۔ اور پھر — اپنی راہ لی۔

ماں بیٹی ایکبار پھر اپنی کم مائیگی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ بڑے لوگ آخر اُن کے یہاں آتے ہی کیوں تھے؟ دونوں نے ہی جیسے یہی سوچا۔

جہاں زیب خوش تھی کہ وہ کوئی بات کیے بنا واپس چلی گئیں۔ کہ وہ سنگین خان کے سوا کسی اور کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہاں اچانک اُس کے ذہن میں سوال اُبھرا۔ اگر سنگین خان کے بابا کا بھی یہی رویہ نکلا تو؟ اور —

سنگین خان کا بھی کیا پتہ؟ اُس نے بھی ایسا ہی کیا تو؟ ابھی تو اُس نے اُن کا گھر اور رہن سہن دیکھی ہی نہیں تھی!

اُس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی۔ امی سے سر درد کا بہانہ کیا۔ اور بمشکل بستر پر آ کر پڑ رہی۔

رات امی ابو سو گئے۔ تو حسبِ معمول اُس نے سنگین خان کو فون کیا۔ ڈاکٹر ضیاء کی بہن کے آنے کا بھی بتایا۔

"کیا؟" وہ اَپ سیٹ ہو گیا۔

"پریشان نہ ہوں۔ اول تو آپ نے ابھی بات ہی نہیں کی میرے پیرنٹس سے۔ اور۔۔۔ پھر۔۔۔ آ بھی گئے ہمارے یہاں۔ تو اُسی جلدی میں واپس پلٹیں گے۔ جیسے آج ڈاکٹر کی بہن گئی ہیں یہاں سے۔۔۔"

"کیا مطلب؟"

"بس۔۔۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کے قابل کہاں؟"

"بتاؤ نا پلیز! کیا ہوا؟"

"یہی کہ۔۔۔ اُنہیں ہمارا گھر ہماری رہن سہن پسند نہیں آئی۔ بات کیے بنا ہی واپس چلی گئیں۔۔۔"

"گڈ۔" وہ ریلیکسڈ لگنے لگا۔ "رہی میری بات۔ تو میں بابا سے تقریباً روزانہ کہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں 'تم آؤ گے۔ تو دونوں جائیں گے'۔۔۔"

زیب نے گہری سانس لی۔

''یہ بھی آزمالیں گے۔ یہ تذلیل بھی قسمت میں لکھی ہوگی۔''

''آج تم کیسی باتیں کررہی ہو؟''

''سچائی بتارہی ہوں۔ سچائی یہی ہے۔''

''یقین کرو۔ میں ہالینڈ میں بابا کے کام میں پھنس گیا ہوں۔ ایک آدھ چکر اور لگے گا۔ کام وائنڈ اَپ کرتے ہی میں آجاؤں گا۔ بس چند دن اور — پلیز!''

وہ مسکرادی۔ اُداس سی!

''میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ بس جب بھی ہمارے گھر آنا ہو۔ جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں۔ آ جائیں اور باہر سے گھر دیکھ کر واپس چلے جائیں۔ پھر مجھے کبھی مت بتائیں۔ کہ آپ آئے تھے۔ لیکن ہماری حیثیت قبول نہ کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مجھ سے قطع تعلق کرلیں گے۔ تو مجھے خود ہی پتہ چل جائے گا۔۔۔'' کہتے کہتے وہ رودی۔

پتہ نہیں کیوں؟ اپنے ساتھ اُسے زینیہ کا ضرور خیال آتا!

''پلیز زیب — میرے بارے میں ایسا مت سوچو۔ اتنی بدگمان کیوں ہو؟ رو کیوں رہی ہو؟''

''بس۔۔۔ میری بہن کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ وہ بھی کسی امیر لڑکے سے پیار کرتی تھی۔ پھر اُس لڑکے نے کسی امیر لڑکی سے دوستی کرلی تھی۔ میری بہن کو مڈل کلاس کا طعنہ بھی دیا تھا۔۔۔'' وہ بے اختیار رونے لگی۔

اُس کی بہن؟ وہ تو اکلوتی تھی؟ شاید کسی کزن وغیرہ کا ذکر کررہی تھی۔

سنگین خان دور بیٹھا پریشان ہورہا تھا۔ آج وہ بہت اَپ سیٹ لگ رہی تھی۔ کچھ ڈاکٹر ضیاء کی بہن کے رویے سے۔ اور کچھ خود سنگین خان کے دیر کرنے کی وجہ سے۔

وہ اُسے دیر تک تسلیاں دیتا رہا۔ جلدی آنے کے وعدے کرتا رہا۔ مگر —

آج پھر ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔ روتے روتے ہی جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

گرمی دم توڑ چکی تھی۔ موسم میں وہ تندی نہ رہی تھی۔ دن خوشگوار اور — شامیں خنک ہوگئی تھیں۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ اسفندیار خان اپنے گھر کے وسیع وعریض لان میں گاؤں سے آئے اپنے کاردار عظیم کے ساتھ بیٹھے چائے پیتے زمینوں سے متعلق مختلف امور پر باتیں کررہے تھے۔

مغرب کی اذان ہوئی۔ تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نماز پڑھنے اندر جانے لگے۔ عظیم بھی سرونٹ کوارٹرز کی طرف ہولیا۔

نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے۔ کہ شاہدہ بیگم دندناتی ہوئیں اُن کے بیڈروم کے اندر آگئیں۔

''خیریت؟'' صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے اُنہوں نے دریافت کیا۔

وہ پرسوں بھی آئی تھیں۔ پیسوں کی ضرورت تو اتنی جلدی نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر — کیسے آئی

تھیں؟ اور دندناتے ہوئے کیوں آئی تھیں؟ ایسا تو اُن کا کوئی رشتہ تھا ہی نہیں آپس میں!

''آپ کے لاڈلے کے کرتوت بتانے آئی ہوں۔'' وہ سامنے والی سیٹ پر براجمان ہوگئیں۔

اُنہیں شاہدہ بیگم کا اپنے بیٹے کے لیے ایسا لب ولہجہ اچھا نہیں لگا۔

''ہمارے لاڈلے کے کرتوت کا تم سے کیا واسطہ؟''

''واسطہ ہے۔'' وہ غصے سے بولیں۔ ''میری بھانجی کے ساتھ اُس کا رشتہ ہوا ہے۔۔۔''

''وہ بات تو ہم کبھی کی ختم کر چکے ہیں۔''

''مگر ہم ایسا نہیں سمجھتے۔''

''اب یہ تم لوگوں کی عقل کا پھیر ہے۔ کہ ختم بات کو بھی ختم نہیں سمجھتے۔''

''ہم لوگوں میں ایکبار منگنی ہو جائے۔ تو ٹوٹتی وٹتی نہیں ہے۔۔۔''

''تم لوگ کون ہو؟ اِس زمین کے باسی نہیں ہو؟''

''چھوڑیں یہ باتیں۔ میں یہ بتانے آئی ہوں۔ کہ سنگین نے نائلہ کا ریپ کیا ہے۔ اور اب وہ اُس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔۔۔''

''کیا؟'' وہ سکتے میں آ گئے۔ پاؤں کے نیچے سے جیسے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔

''ہاں۔ یہی بتانے آئی تھی میں۔ اب آپ مزید کوئی تاخیر کیے بنا دونوں کی شادی کا بندوبست کریں۔''

''لیکن سنگین تو کافی دنوں سے برائیٹن میں ہے۔ اور نائلہ یہاں پاکستان میں ہے۔''

اسفندیار خان کے لب ولہجہ میں وہ تندی نہ رہی تھی۔

''نائلہ لنڈن گئی تھی۔ اپنے گھر۔''

''تو سنگین اُس کے گھر گیا تھا۔''

''نہیں۔ وہ برائیٹن گئی تھی۔''

''سنگین کے پاس۔''

''ہاں۔ ظاہر ہے اِس بات کا تو پتہ چلنا تھا۔ وہ مکر نہ سکیں۔

''وہ کیوں گئی تھی اُس کے پاس؟ غلطی اُس کی بھی ہے۔''

''جو بھی ہے۔ سنگین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''اول تو نائلہ کو اُس کے پاس جانا نہیں چاہیے تھا۔ وہ اکیلا رہتا ہے وہاں۔ ایک جوان لڑکی کو ایک جوان لڑکے کے پاس اکیلے میں نہیں جانا چاہیے۔ اور پھر ہم۔۔۔ پوچھیں گے سنگین سے۔ ہمیں اُس سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔۔۔''

''توقع تھی یا نہیں۔ اب آپ دونوں کے نکاح کی تیاری کریں۔'' وہ اٹھیں اور——

کھٹ پٹ کرتیں اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کرتیں باہر نکل گئیں۔

اسفندیار خان دم بخود بیٹھے رہ گئے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ سنگین نے یہ کیا کر دیا تھا؟

وہ ایسا ہے تو نہیں۔ دل نے کہا۔

اچانک اُنہیں لگا۔ یہ کوئی سکیم تھی سنگین خان کے خلاف!

وہ اٹھے اور——

اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اپنے لینڈ لائن سے سنگین خان کا نمبر ملانے لگے۔ وہ ہالینڈ میں تھا اِن دنوں۔

بہت کوشش کی۔ مگر اُس کا سیل نمبر تھرو ہو ہی نہیں رہا تھا۔

اُنہوں نے ندیم کا سیل ٹرائے کیا۔ جلدی ہی مل گیا۔

''ندیم۔ نائلہ آئی تھی ہم نے سنا ہے۔'' چھوٹتے ہی وہ بولے۔

''یَس سَر۔'' وہ مؤدب طریق سے بولا۔ ''وہ آئیں تھیں۔ دو راتیں رہ کر واپس لنڈن چلی گئیں۔''

''اوہ'' وہ اتنا ہی بولے۔ اب وہ ——

پریشان نہیں، غصے میں لگ رہے تھے۔

''سنگین کہاں ہے؟ اُس کا سیل آف آ رہا ہے۔''

''سَر۔ وہ ہوٹیل میں نہیں ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ سے بات کرانے کی۔''

''ہاں۔ اُس کو کہو کہ ہم سے بات کرے۔''

''اوکے سَر۔''

اسفندیار خان نے فون بند کر دیا۔ بستر پر تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

اب اُنہیں سنگین خان پر شک ہونے لگا۔ شاید کہ ایسی حرکت کر ہی بیٹھا ہو۔ جبھی اُن سے ذکر تک نہیں کیا اُس کے آنے کا۔ جب کہ وہ کبھی اُن سے کوئی بات چھپاتا نہیں تھا۔

لیکن۔۔۔ دو راتیں ۔۔۔ ایک جواں آدمی کے ساتھ اکیلے ایک ہی گھر میں۔

کہاں کی شرافت تھی؟

پر۔۔۔ ایسا اگر ہو بھی گیا تھا۔ تو سنگین نے ایسی نیچ حرکت کیوں کی؟

پہروں اُن کے دل و دماغ میں جنگ جاری رہی۔ کبھی سنگین خان قصوروار نظر آتا۔ اُس پر غصہ آتا۔ تو کبھی نائلہ کے وہاں اکیلے قیام پر حیرت ہوتی۔ اور وہ ہی دوشی نظر آتی!

عجیب مخمصے میں پڑ گئے تھے وہ!

رات بارہ بجے اُنہیں سنگین خان ہاتھ آ ہی گیا۔ شاہدہ بیگم کی کہی تمام بات اُس کے گوش گزار کر دی۔

"What?" سنگین خان کے حیرت کی انتہا نہیں تھی۔

چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

''بابا میں اُس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے کہہ دیا۔'' اُس کے لہجے میں چنگھاڑ تھی۔

"Calm down." بابا بولے۔ اُس کی حیرت اور لب و لہجے سے اُنہیں اُس کے بے قصور ہونے کی کچھ کچھ اُمید بندھ گئی۔ ریلیف بھی محسوس ہوا۔ ''نائلہ وہاں کیوں آئی تھی؟ راتیں کیوں گزاری تھیں؟ کچھ بتایا تھا اُس نے؟''

''وہ مجھ سے ہی ملنے آئی تھی۔ راتیں بھی اِسی لیے گزاری تھیں۔ کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو۔ اور وہ اُسی کو لیکر مجھ سے شادی کر سکے۔ ایک سیکنڈ بابا۔'' اُس کے ذہن میں اچانک کوندا سا لپکا۔ ''اُس کا وہی بوائے فرینڈ جس کے ساتھ میں نے اُسے میریٹ میں دیکھا تھا۔ وہ اُسے لندن بھی ساتھ لائی تھی۔ ہوسکتا ہے نائلہ کے اُس کے ساتھ Illicit relations تھے۔ اور وہ اپنا گناہ

مجھ پر تھوپنے کی کوشش میں میرے پاس چلی آئی تھی۔ پھر بھی ۔۔۔ "I'm not sure Baba" کہ وہ کس کا گناہ لیے پھر رہی ہے۔۔۔''

اسفندیار خان کے سر سے دھیرے دھیرے بوجھ اُترتا گیا۔ لیکن ۔۔۔ پھر بھی ۔۔۔ اپنی تسلی کی خاطر ہی ۔۔۔

''بیٹا اگر کچھ ایسا ہوا ہے۔ انسان خطا کا پُتلا ہے۔ تو ہمیں بتا دو۔ ہم جاننا چاہیں گے۔'' اُنہوں نے کہا۔

''آپ کی قسم بابا۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ جس سے آپ کی دل آزاری ہو۔۔۔''

''بس بابا کی جان۔ اور کچھ مت کہو۔ ہم سب سمجھ گئے ہیں۔ کاش آج تمہاری اپنی ماں ہوتی۔۔۔'' بابا کی آواز جیسے دور سے آ رہی تھی۔ وہ بے حد دکھی لگ رہے تھے۔

وہ تڑپ اٹھا۔ بابا بہت دور تھے۔ وہ اُنہیں تسلی دینا چاہتا تھا۔ خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

''بابا آپ ہیں نا میرے سب کچھ۔ ماں بھی باپ بھی۔ مجھے تو کبھی کسی کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔''

''لیکن ہمیں ضرور ہوا ہے۔ تمہاری اپنی ماں ہوتی۔ تو ایسی گھناؤنی سازشیں کرتی تمہارے خلاف؟''

''بس بھول جائیں بابا۔ اپنا خیال رکھیں۔ میں بس فارغ ہوتے ہی آ جاؤں گا۔ اور تب تک ۔۔۔ صرف اچھی اچھی باتیں ہی سوچنی ہیں۔ رائیٹ بابا؟''

''رائیٹ جانِ بابا۔ اب ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ ورنہ۔۔۔ کچھ دیر قبل تک تو ہم جانے کیا کیا سوچ رہے تھے۔ کہ نائلہ کو انصاف دلانے تمہارا نکاح کروائیں گے اُس کے ساتھ۔ اور اُس کے بعد جو اندھیرے چھا جانے تھے ہمارے گھر میں وہ الگ ۔۔۔ ساتھ میں بار بار زیب کا خیال آتا۔ اتنی اچھی بچی ہے۔ اُسے کھو دینے کا دکھ اور زیادہ پریشان کر رہا تھا۔۔۔''

''فور گوڈ سیک بابا۔ آپ تو واقعی بہت پریشان ہیں۔ میں اِس کو سمجھوں گا واپس آ کر۔''

''چھوڑو بیٹا۔ اِس کا بہترین حل یہی ہے۔ کہ تمہارے آتے ہیں ہم تمہارا نکاح زیب سے کرا دیں۔ نائلہ کیا کہتی ہے؟ شاہدہ کیا کہتی ہے؟ اِس کی کوئی پرواہ نہیں۔''

"اب ہوئی نا بات۔" وہ خوشگواری سے بولا۔

"ہمارے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے۔ اب ہمیں نیند بھی آجائے گی۔ ورنہ کوئی پریشانی کی بات ہوتی ہے تو tranquilizers بھی اثر نہیں کرتے پھر۔"

"آپ کچھ مت سوچیں بابا۔ اور بس آرام سے سو جائیں۔" اُس نے محبت سے کہا۔

"ہاں جانِ من۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔ او کے۔ بآمانِ خدا۔"

"Have a good sleep Baba. Good night"

فون بند ہوا۔ تو وہیں صوفے پر دراز وہ دیر تک اِسی بات کو سوچتا رہا۔ کیا کیا سازشیں کر رہی تھی نائلہ اُس کے خلاف۔ زیب کو بھی اُس سے بددل کرنے کو فون کر کے اُس نے یہی کہا تھا۔ کہ وہ اُس سے پریگنینٹ تھی۔ خود سنگین خان کو زیب سے بدظن کرنے کو کسی سِدرہ کو زیب بنا کر ڈاکٹر ضیاء کو فون کرواتی رہی تھی۔ پھر وہ چونکا ——

اُس کے برائیٹن آنے اور اُس کے پاس راتیں گزارنے کا پلین یقیناً نائلہ اور مما نے مل کر بنایا تھا۔ اور پھر نائلہ تو کسی طرح اُسے چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ سمجھ گئی کہ وار کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ تو مایوس ہو کر بغیر ملے ہی واپس چلدی۔ اِن لوگوں نے کیا سمجھا تھا اُسے؟ کیا اتنا کمزور؟

بہرحال —— وہ اٹھا۔ جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ اُسے کسی سے ضروری ملنا تھا۔ تیار ہوا۔ تو نیچے آیا۔ ہوٹیل کی رینٹ کی ہوئی گاڑی میں بیٹھا اور ——

چل دیا۔

موسم نے بھرپور انگڑائی لی تھی۔ بے تحاشہ گرمی سے حواس باختہ لوگ سردی کی آمد پر خوش تھے۔ گرم کپڑوں میں ملبوس یہاں وہاں کاروبارِ زندگی میں مصروف تھے۔

زیب کا سیکنڈ پیریڈ شروع ہوا ہی تھا۔ کہ اُس کے سیل پر سنگین خان کا میسج آگیا۔ بابا آج شام اُن کے گھر اُس کا رشتہ لیکر آ رہے تھے۔ 'کہیں نا مت کہہ دینا۔' اُس نے مذاق میں لکھا تھا۔

مارے خوشی کے اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

یونیورسٹی سے آئی۔ کھانے کی میز پر ماں بیٹی بیٹھیں کھانا کھانے لگیں۔ اُسے بار بار سنگین خان کے میسج کا خیال آیا۔ مگر چاہتے ہوئے بھی امی سے کچھ نہیں کہا۔ کہ وہ خود کو بیچ میں نہیں لا سکتی تھی۔ امی ابو کو اُس کی پسند کا پتہ چلا۔ تو اچھا نہ سمجھتے۔ اُس نے سنگین خان سے بات بھی کی تھی۔ اُس نے

اُسے تسلی دی تھی۔ کہ وہ گھر میں کچھ نہ بتائے۔ بابا بھی اِس قسم کا کوئی ذکر نہیں کریں گے۔ اُس نے کہا تھا وہ بابا کو بھی سمجھا دے گا۔ لیکن—

بابا کے لیے شام چائے پر کچھ نہ کچھ اہتمام بھی تو ہونا چاہیے تھا۔ ابو بھی گھر پر نہیں تھے۔ ضروری کام سے دو دن کے لیے شہر سے باہر گئے تھے۔ اُس نے سنگین خان کو بتایا بھی کہ اُس کے ابو گھر پر موجود نہیں تھے۔ لیکن سنگین خان کو جلدی تھی۔ کیونکہ بابا بھی صبح چار بجے کی فلائیٹ سے دو ہفتے کے لیے ایک میٹنگ کے سلسلے میں جرمنی جا رہے تھے۔ بہر حال —

''امی۔'' اُس نے جھجکتے جھجکتے ابتدا کی۔'' آج۔۔۔میری فرینڈ کے انکل آ رہے ہیں ہمارے گھر۔''

''فرینڈ کے انکل؟'' اُنہوں نے دہرایا۔

اُس کے خوبصورت چہرے پر لالی سی چھائی ہوئی تھی۔ نظریں جھکی جا رہی تھیں۔ ضرور کوئی بات تھی۔ کیا؟ اُنہوں نے جاننا چاہا۔

''جی امی۔''

''کس لیے؟'' امی کچھ کچھ سمجھ گئیں۔ اُسے چھیڑنے کے انداز میں بولیں۔

''اُن کا بیٹا ہے۔ اُس۔۔۔کے لیے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔ جس گھر میں لڑکی ہوتی ہے۔ وہاں لوگ تو آتے ہی ہیں۔'' اُنہوں نے گہری سانس لی۔ فکر مندی سی۔ کہ اگر بڑے گھر والے ہوں گے۔ تو پہلے والوں جیسا انجام نہ ہو۔ اُنہیں اپنی پرواہ نہیں تھی۔ زیب کی کم مائیگی کا احساس اُنہیں پریشان کرتا تھا۔'' خدا تمہارے نصیب اچھے کرے بس۔ آمین۔''

اِس کے بعد وہ اِس سلسلے میں کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

''اُن کے ساتھ کوئی خاتون تو ہوگی نا۔ تمہارے ابو بھی گھر پر نہیں ہیں۔'' وہ خود ہی کہنے لگیں۔

یہ بات تو سنگین خان نے پہلے ہی کہہ دی تھی۔ فیاض صاحب گھر پر بھی ہوتے۔ تو بھی بابا خوش بخت کو ساتھ لاتے۔ اُنہوں نے اُسے گودوں پالا تھا۔ بابا اُنہیں خاص اہمیت دیتے تھے۔ پھر

یہ تو سنگین خان کے رشتے کی بات تھی۔ ایسے میں اُنہیں کیسے پیچھے چھوڑا جا سکتا تھا!

''ہاں۔ ہوگی۔'' اُس نے مختصراً کہا۔

''تم بس ایک نظر ڈرائینگ روم پر ڈال لو۔ فضل کریم کا تمہیں پتہ ہے آدھی ڈسٹنگ ہڑپ کر جاتا ہے۔ باقی چائے وغیرہ کا کام میں سنبھال لوں گی۔''

''ٹھیک ہے امی۔''

دوپہر آرام کرنے سے پہلے ہی اُس نے ڈرائینگ روم دیکھا۔ باہر گیٹ تک نظر دوڑائی۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ صفائی ہو چکی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ طے کرتے ہوئے شام ٹھیک پانچ بجے اسفندیار خان، فیاض صاحب کے گیٹ پر تھے۔

شوفر نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کال بیل دبائی۔ تو فضلِ کریم بھاگا گیا۔ گیٹ کھولا۔ اور—

اسفندیار خان اور ماما خوش بخت کو ڈرائینگ روم میں لا بٹھایا۔

فوزیہ دوپٹہ اچھی طرح اوڑھے اندر گئیں۔ اسفندیار خان نے تعظیماً اٹھتے ہوئے اُنہیں سلام کیا۔ ماما خوش بخت تو یوں گلے ملیں۔ جیسے برسوں کی جان پہچان تھی۔

پھر— تینوں بیٹھ گئے۔

اسفندیار خان اپنا اور ماما خوش بخت کا تعارف کروانے کے بعد جلدی ہی اپنے مطلب پر آ گئے۔

''خوش بخت۔ تم بات کرو گی یا ہم کریں؟'' اُنہوں نے ماما سے خوشگواری سے پوچھا کہ — اِس وقت وہ اُنہیں خاص طور سے اس مبارک کام میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ خوشی اُن کے اَنگ اَنگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

فوزیہ اُن کی منکسر المزاجی اور عاجزی پسندی سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکیں۔

''صاحب آپ ہی بات کریں۔ مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔'' ماما خوش بخت بولیں۔ کہ اُنہیں

معلوم تھا سنگین خان میں اُن کی جان تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اُنہوں نے کہا۔ پھر— رخ فوزیہ کی طرف کرلیا۔

"بہن۔ ہم اپنے بیٹے کے لیے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گی۔"

آج فوزیہ کو پہلی بار معلوم ہوا۔ مال و دولت والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جنہیں نہ اُن کے علاقے کی پرواہ تھی نہ اُن کے سیدھے سادھے دو چار کمروں والے چھوٹی سے گھر کی۔ نہ یہ کہ وہ لوگ کون تھے؟ نہ یہ کہ وہ کیا کرتے تھے؟

فوزیہ چند پل خاموش رہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں؟

"بہن آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ فیاض صاحب سے مشورہ کریں۔ اپنا وقت لیں۔ تسلی سے جواب دیں۔ جیسی آپ کی بیٹی ہے۔ ویسی ہی ہماری بھی بیٹی ہے۔۔۔"

"جی۔ میں فیاض صاحب سے بات کروں گی۔۔۔"

تبھی فضلِ کریم چائے اور اُس کے ساتھ چکن سینڈوچز اور کیک لے آیا۔

اُسے دیکھ کر اسفندیار خان کو مایوسی سی ہوئی۔ وہ تو دنوں بعد ایکبار اور زیب کو دیکھنے کی آس لیے آئے تھے۔ جانے کیوں؟ وہ اُنہیں کچھ ایسی بھا گئی تھی۔ کہ بس اُسی کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ یا پھر یہ سنگین خان سے اُس کے بے پناہ محبت تھی جو اُنہیں اُس کی محبت کو دیکھنے کے لیے بے تاب کررہی تھی!

"بہن۔ آپ کی بچی نہیں آئے گی کیا؟"

فوزیہ نے لحہ بھر کو کچھ سوچا۔ اتنی مشفق ہستی اُسے ملنے کو کہہ رہی تھی۔ دوسرا یہ کہ اُنہیں حق بھی تھا۔ کہ اُسے دیکھیں۔ آخر تو اپنے بیٹے کے لیے اُس کا رشتہ مانگنے آئے تھے!

"جی۔ میں بلاتی ہوں۔" وہ میز پر چائے کے برتن رکھتے ہوئے بولیں۔

پھر— اُنہیں چیزوں سرو کیں۔ اور زیب کو بلانے چل دیں۔

جلدی ہی زیب اُن کے سامنے تھی۔ پستئی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس— جھکی جھکی نظریں، چہرے پر حیا کی لالی، اُس کے بے پناہ حسن میں مزید اضافہ کررہی تھیں۔

اپنے بیٹے کی پسند آج اُنہیں پھر حیران کرگئی۔

"یہاں آؤ بیٹی۔ ہمارے پاس بیٹھو۔" اُنہوں نے شفقت سے کہا۔

وہ آہستہ سے جا کر اُن کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو بیٹی؟" اُنہوں نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔" اُس نے مختصراً کہا۔ کیونکہ— مزید کچھ کہتی۔ تو امی کو شک گزرتا۔ کہ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

اسفندیار خان بہت خوش لگ رہے تھے۔ چائے بھی پیتے جارہے تھے۔ اور— اُسے دیکھکر، اُس سے باتیں کرکے اپنا جی بھی سیر کررہے تھے۔

چائے کے بعد وہ دس پندرہ منٹ بیٹھے رہے۔ پھر— فوزیہ کو ایکبار پھر یاد دہانی کراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بہن۔ اب ہم اجازت چاہیں گے۔ راستہ بھی خاصا ہے۔ اور ہم نے صبح ہی صبح ایک میٹنگ کے لیے بھی روانہ ہونا ہے۔" وہ خوش خلقی سے بولے۔

فوزیہ اور زیب اُن کے ساتھ گاڑی تک آئیں۔ اور وہ دونوں رخصت ہوگئے۔

"کیوں خوش بخت۔ کیسی لگی ہماری بہو؟" گاڑی کے آبادی سے باہر نکلتے ہیں اسفندیار خان گویا ہوئے۔

"چندے آفتاب چندے مہتاب ہے صاحب۔ عادتوں کی بھی اچھی لگتی ہے۔ اور صاحب !ایک اور اچھی بات ہے اُس میں۔۔۔"

"کیا؟" وہ خوش خوش بولے۔

"حیا ہے اُس میں۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ کیسے سر پر دوپٹہ لیے تھی۔ نظریں اوپر اٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔ آج کل کی لڑکیوں میں یہ بات کہاں؟ بہو، بیٹیاں سب بزرگوں کے آگے ننگے سر پھرتی ہیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہیں۔ توبہ توبہ کیا وقت آن لگا ہے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

"تو تمہیں پسند آگئی ہماری بہو؟"

''وہ ہے ہی پسند آنے والی صاحب۔''

''ہاں۔سنگین کی پسند ہوگی۔اور بُری ہوگی؟'' وہ بہت فخر سے بولے۔

''شکر ہے اللہ کا صاحب۔کہ نائلہ بی بی سے بات ختم ہوگئی۔میں تو سب سمجھتی تھی۔یہ چھوٹی بیگم صاحبہ اور نائلہ بی بی کی ملی بھگت تھی۔بہت خود کو حیادار اور کیا کیا بنائے رکھا یہاں۔مگر پتہ نہیں کیوں میرے دل کو تسلی نہیں ہوتی تھی۔لگتا تھا اندر کچھ کھچڑی پک رہی ہے۔شکر ہے وقت پر سب سامنے آگیا۔ورنہ شادی ہو جاتی۔تو پھر تو بہت مشکل ہونی تھی صاحب۔۔۔''

ماما خوش بخت گھر سے سارے حالات سے واقف تھیں۔سنگین خان کی والدہ کے وقتوں کی یہاں ملازمہ تھیں۔ہر اونچ نیچ سے واقف تھیں۔کہاں بڑی بیگم اور کہاں چھوٹی بیگم؟ زمین آسمان کا فرق تھا دونوں میں۔ایک حیا کی پُتلی،دوسری حیا نام سے بے بہرہ۔اِسی طرح ایک مزاج میں شبنم تو دوسری شعلہ۔ایک منکسر المزاج،غریب پرور تو دوسری مغرور،غریبوں سے نفرت کرنے والی۔اور بچاری ماما خوش بخت کو تو جوتی کی نوک پر رکھتی تھیں۔کہ وہ جو بڑی بیگم کی وفادار تھیں۔اور اسفندیار خان کی عزت اور سنگین خان سے محبت کرتی تھی۔یہ سب اُن کے مزید غصے کا باعث تھا۔

''خوش بخت ہم نے تو شکرانے کے نفل پڑھے ہیں کہ نائلہ جیسی لڑکی سے سنگین بچ گیا ہے۔دیکھو کیا غلیظ الزام لگایا ہے ہمارے بچے پر۔''

خوش بخت کو سب معلوم تھا۔نائلہ کا برائیٹن جانا۔پھر سنگین خان پر الزام لگانا۔سب!

''توبہ توبہ۔'' ماما نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔''خود کو چاہے بدنام کرلو۔لیکن دوسرے کو پھنسالو۔۔۔''

''خوش بخت وہ اور لوگ ہوتے ہیں جنہیں اپنی بدنامی کا خیال ہوتا ہے۔یہ لوگ جانیں کیا چیز ہے؟ ناموس کس بلا کا نام ہے؟''

''صاحب مجھے تو یہ بچی بہت پسند آئی ہے۔'' ماما خوش بخت بولیں۔

''بس دعا کرو۔کہ ہماری مراد پوری ہو۔اور ہم اُسے اپنے گھر لے آئیں۔''' اُن کے لب ولہجہ میں آج زیب کے لیے بھی محبت کا ایک جہان آباد تھا۔

''انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔'' ماما خوش بخت نے کہا۔

تقریباً تمام راستہ وہ لوگ یہی ڈسکشن کرتے رہے۔

رات کے نو بج رہے تھے جب اُن کی گاڑی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

ڈنر کے بعد اسفندیار خان نے عشاء کی نماز ادا کی۔اب وہ فارغ بھی تھے۔اور تازہ دم بھی۔اپنے بستر میں تکیوں سے پشت ٹکاتے ہوئے اُنہوں نے سنگین خان کو فون ملایا۔

''بیٹا۔ہم اور خوش بخت گھنٹہ ڈیڑھ پہلے زیب کے گھر سے لوٹے ہیں۔بات کرلی ہے اُس کی والدہ کے ساتھ۔۔۔''

''پھر؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

وہ شفقت سے مسکرائے۔

پھر یہ کہ — اُنہوں نے دو چار روز مہلت مانگی ہے سوچنے کے لیے۔اور پھر زیب کے والد بھی گھر پر نہیں تھے۔۔۔''

''اچھا۔۔۔''

''کیا بتائیں۔کہ ہم اور خوش بخت کتنی مشکل میں تھے۔یہ بات چھپانے کو کہ ہم زیب کو پہلے سے جانتے تھے۔اور یہ کہ اُس کی ملاقات برائیٹن میں تم سے ہو چکی ہے۔بہت احتیاط سے بات کرنا پڑ رہی تھی۔۔۔''

وہ ہنس دیا۔دلآویزی سے۔

''بابا زیب کا بھرم تو رکھنا تھا نا۔''

''رکھ لیا۔رکھ لیا۔ویسے ہم اُس سے بھی ملے ہیں۔۔۔''

''اچھا؟'' وہ حیرت سے بولا۔''آئی تھی آپ سے ملنے؟''

''ہم نے بلوایا تھا۔دراصل ہمارا خیال تھا۔کہ وہ چائے وغیرہ لیکر جیسے فلموں میں ہوتا ہے خود آجائے گی۔مگر ایسا نہیں ہوا۔اُن کا ملازم چائے لیکر آیا۔ہم سے نہ رہا گیا۔اُس کی والدہ کو کہہ ہی دیا۔پھر وہ لے آئیں اُسے۔'' وہ بے اختیار ہنسے۔''ہم دونوں بالکل یوں ملے۔جیسے ایک دوسرے کو پہلی بار مل رہے ہیں۔ہمارا خیال ہے تم نے اُس کو بھی سمجھا دیا تھا۔وہ بھی محتاط تھی۔''

وہ بھی ہنس دیا۔خوشگواری سے۔

''میں نے نہیں بابا۔ اُس نے کہا تھا۔ کہ اُس کے والدین یہ نہ جاننے پائیں۔ کہ وہ پہلے سے ہمیں جانتی تھی۔''

''اوہ۔ ہمیں اچھا لگا۔ بائے داوے یہ کیا بات ہے۔ کہ ہمیں اُس کی ہر ادا اچھی لگتی ہے؟''

''اُنہوں نے حسبِ عادت سنگین خان کو چھیڑا۔

''بابا۔ Be careful وہ آپ کی ہونے والی بہو ہے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ اِسی طرح یاد دلایا کرو۔ پتہ نہیں کیوں؟ ہماری بھولنے کی عادت بڑھتی جا رہی ہے۔''

دنوں ایک ساتھ ہنس دیئے۔ دونوں کی ہنسی میں خوشی کی جھنکار تھی۔

''بس۔ اُن کی 'ہاں' کا انتظار ہے۔ جوں ہی 'ہاں' ہوگی۔ ہم تمہارا نکاح اُس کے ساتھ کروادیں گے۔ رخصتی بعد میں ہوگی۔ اور بہت دھوم دھام سے ہوگی انشاء اللہ۔ لیکن نکاح تک سب کچھ خاموشی سے ہونا چاہیے۔ خوش بخت کو بھی ہم نے سمجھا دیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ بات کا چرچا ہو۔ پہلے ہی بہت نامناسب باتیں بن چکی ہیں تمہارے خلاف۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بابا۔''

پھر دونوں باپ بیٹے نے اِدھر اُدھر کی چند باتیں کیں۔ اور فون بند کر دیئے۔

زیب کا سنگین خان کے ساتھ نکاح ہو گیا تھا۔ دنیا میں کیا ایسی بھی حسین اور لذت آمیز خوشی ہو سکتی ہے۔ یہ زیب نے پہلی بار جانا تھا۔ اُس کے دن مُسکار ہے تھے۔ تو راتیں گنگنا رہی تھیں۔ ایسی مسکان جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسی گنگناہت جو اُس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

کیا اپنی محبت کو پالینا اتنا ناقابلِ بیان خوبصورت جذبہ ہوتا ہے؟ وہ سوچے بنا نہ رہتی۔

سنگین خان آتی جاتی سانس بن گیا تھا اُس کی۔ زندگی بن گیا تھا اُس کی!

وہ جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگی تھی۔ سپنے سہانے!

جاڑے اپنے قدم جما چکے تھے۔ دن چھوٹے راتیں لمبی ہو گئی تھیں۔ اِدھر چمپئی دن طلوع ہوا۔ اُدھر سُرمئی شام گھر آئی۔ گلابی دنوں اور سیندوری شاموں کی آنکھ مچولی بہت حسین تھی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ چاروں اور بادل گھِر آئے تھے۔ سردی بڑھ گئی تھی۔

زیب کا کل ٹسٹ تھا۔ وہ اپنے بیڈروم میں کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی اب بھی پڑھ رہی تھی۔

پرندوں کے غول اپنے اپنے آشیانوں کی جانب چلے۔ تو اُس کی محویت ٹوٹی۔ کتاب بند کر دی۔ پردے برابر کیے۔ اور لائیٹ آن کر دی۔ باہر نکلنے کو ہی تھی۔ کہ —

اُس کا فون بج اُٹھا۔ اجنبی سا نمبر تھا۔

''ہیلو۔'' اُس نے کہا۔

''مجھے پہچانا؟'' ایک wicked سی ہنسی کے ساتھ نسوانی آواز اُبھری۔

''نہیں۔ کون بول رہی ہیں؟''

''نائلہ۔''

''اوہ۔'' وہ اتنا ہی بولی۔

''میں نے سوچا نکاح کی مبارکباد دوں۔''

''تھینک یو۔''

''تمہیں ایک زبردست خبر بھی دینی تھی۔۔۔''

وہ خاموش رہی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

''تمہیں پتہ ہے۔'' وہ خود ہی کہنے لگی۔ ''جس لڑکے سے تمہاری بہن محبت کرتی تھی اور جس کو سی آف کرنے وہ ائیر پورٹ جا رہی تھی۔ وہ سنگین ہی ہے۔ سنا ہے تمہاری بہن اُسے بہت چاہتی تھی۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ تمہیں اُس سے بہت نفرت تھی۔ تم کیا کرتی تھیں۔ کہ تمہارا دل چاہتا ہے اُسے مار ڈالو۔ ویسے۔۔۔ اچھی بات ہے۔ ایک بہن ختم ہوگئی۔ تو دوسری نے سنبھالا دیا سنگین 'خان' کو۔'' اُس نے طنزیہ انداز میں 'خان' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی بہن کے عاشق کو۔۔۔

آگے وہ کیا کیا کہہ رہی تھی؟ اُسے کچھ پتہ نہیں چلا۔ بس —

کمرے کی ہر چیز گھومتی دکھائی دی۔ پھر —

آنکھوں کے آگے تاریکی چھا گئی۔ اور —

وہ کھڑے قد سے فرش پر جا گری۔

نزدیک ہی فوزیہ کچن میں کام کر رہی تھیں۔ اُس کے دھڑام سے گرنے کی آواز سن کر وہ فوراً کچن سے باہر آگئیں۔ پھر اُس کے کمرے کی طرف لپکیں۔

زیب کو نیچے کارپٹ پر بے سدھ پڑے دیکھکر اوسان خطا ہو گئے۔ جلدی سے پاس بیٹھ گئیں۔ اُس کا سر اپنی گود میں رکھا۔

''زیب۔۔۔ زیب بیٹے۔'' وہ اُس کا چہرہ تھپتھپانے لگیں۔

مگر — زیب بے خود اور بے دم پڑی تھی۔

''زیب بیٹا۔۔۔ میری جان کیا ہوا؟''

زیب ہوش میں ہوتی تو جواب دیتی!

فیاض صاحب بھی گھر پر موجود نہیں تھے۔ فوزیہ مارے پریشانی کے بوکھلائی جا رہی تھیں۔

''فضل کریم۔۔۔ فضل کریم۔۔۔'' اُنہوں نے ملازم کو آواز دی۔

وہ بھاگا چلا آیا۔

''بھاگو ڈاکٹر صاحب کے گھر۔ کہنا جلدی آجائیں۔ زیب بے ہوش ہوگئی ہے۔''

وہ واقعی بھاگا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اُن کے پڑوسی ڈاکٹر حنیف کو ساتھ لیتا آیا۔

تب تک زیب ہوش میں آ چکی تھی۔ لیکن ابھی بھی فوزیہ وہیں فرش پر اُس کا سر گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ زیب کی آنکھیں بند تھیں۔ لمحوں میں ہی دنوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

ڈاکٹر اور فوزیہ نے مدد دیکر اُسے بستر پر لٹایا۔ ڈاکٹر نے چیک اَپ کیا۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔

''اچانک صدمے سے ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔'' وہ اُس کے پاس سے ہٹتے ہوئے فوزیہ سے بولے۔ پھر اپنے فرسٹ ایڈ بوکس میں سے دوائی نکالی۔ ''ایک گولی ابھی دیدیں۔ نیند آجائے گی۔ اُس سے فرق آجائے گا۔ باقی دوائیں لکھ دیتا ہوں۔ یہ بھی باقاعدگی سے دیں۔ کل تک انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ اُنہیں تسلی دیتے ہوئے نسخہ لکھنے لگے۔

''ٹھیک ہے۔ بہت شکریہ۔'' فوزیہ ممنون لہجے میں بولیں۔

ڈاکٹر حنیف چل دیئے۔ تو فوزیہ نے اُن کی دی ہوئی گولی زیب کو کھلا دی۔ پھر — نسخہ

اور پیسے فضل کریم کو پکڑائے۔اور دوائی لینے بھیج دیا۔

گھنٹہ بھر بعد فیاض صاحب بھی گھر آ گئے۔فوزیہ نے زیب کا حال بتایا۔تو پریشان ہو گئے۔زیب کے کمرے میں گئے۔وہ سو رہی تھی۔واپس نکل آئے۔کہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔

میاں بیوی دونوں پریشان سے بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔

''کیا صدمہ ہو سکتا ہے زیب کو؟'' فیاض صاحب تشویش سے بولے۔

''مجھے خود اندازہ نہیں۔ٹھیک ہو گی انشاءاللہ تو طریقے سے پتہ کروں گی۔اللہ نہ کرے کوئی صدمہ ہو۔تھک بھی جاتی ہے سارا دن یونیورسٹی میں۔آجکل لڑکیوں کا کھانا بھی بس برائے نام ہی ہوتا ہے۔ناشتہ تو کبھی کر کے جاتی نہیں۔۔۔'' وہ مختلف پہلوؤں پر غور کر رہی تھیں۔

زیب کی آنکھ کھلی۔تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔فوزیہ وہیں اُس کے کمرے میں کارپٹ پر میٹرس ڈال کر پڑ رہی تھیں۔اُسے جاگتے دیکھا۔تو اٹھ کر اُس کے قریب آ گئیں۔

''کیسی ہو بیٹا؟''

''ٹھیک ہوں امی۔'' وہ نقاہت سے بولی۔

''بیٹے کچھ کھالو۔تاکہ تمہیں دوائیاں دوں۔''

''امی دل نہیں کر رہا۔''

''لیکن ضروری ہے نا میری جان۔خالی پیٹ دوائی کیسے دوں؟'' تمہارے لیے سُوپ بنایا ہے۔وہ پی لو۔اور چاول ہیں بالکل نرم۔کھالو۔کچھ تو پیٹ میں جائے نا۔''

اُس نے خاموشی سے حامی بھر لی۔

فوزیہ نے سوپ اور چاول گرم کیے۔سوپ بول میں اور چاول پلیٹ میں ڈالے۔اور ٹرے میں لیے اُس کے پاس آ بیٹھیں۔

اُسے سوپ بھی پلایا۔اور دو تین چمچ چاول بھی۔پھر دوائی کھلائی۔اور دوبارہ سونے کا کہہ دیا۔

خود بھی کچن میں برتن رکھتے ہوئے واپس آئیں۔اور وہیں میٹرس پر لیٹ رہیں۔

زیب نے کچھ سوچنا چاہا۔کچھ اکٹھا کرنا چاہا۔مگر ایک بار پھر غنودگی نے آ لیا۔اور—

دونوں ماں بیٹی سو گئیں۔

زیب صبح اٹھی۔تو ہوش و حواس میں تھی۔پہلا خیال وہی آیا۔کہیں اُس نے خواب تو نہیں دیکھا تھا؟ ایک لمحے کو اُس نے سوچا۔پھر—

نائلہ کی ایک ایک بات کانوں میں گونجنے لگی۔

'جس لڑکے سے تمہاری بہن محبت کرتی تھی۔اور جس کو سی آف کرنے وہ ایئر پورٹ جا رہی تھی۔وہ سنگین ہی ہے۔۔۔

تمہیں اُس سے بہت نفرت تھی۔تم کہا کرتی تھیں۔کہ تمہارا دل چاہتا ہے اُسے مار ڈالو۔۔۔

ویسے۔۔۔اچھی بات ہے۔ایک بہن ختم ہو گئی۔تو دوسری نے سنبھالا دیا سنگین 'خان' کو۔۔۔

الفاظ پگھلے سیسے کی مانند اُس کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔اُس نے دونوں کان ہاتھوں سے ڈھک لیے۔

'جس لڑکے سے تمہاری بہن محبت کرتی تھی۔اور جس کو سی آف کرنے وہ ایئر پورٹ جا رہی تھی۔وہ سنگین ہی ہے۔۔۔سنگین ہی ہے۔۔۔سنگین ہی ہے۔۔۔

الفاظ پگھلے سیسے کے آر پار جا رہے تھے۔

'وہ سنگین ہی ہے۔۔۔سنگین ہی ہے۔۔۔سنگین ہی۔۔۔''

اور—بے ساختہ اُسکی چیخیں نکل گئیں۔

فوزیہ کچن سے بھاگتی ہوئی آئیں۔

زیب اب بھی بستر میں تھی۔تکیے پر اوندھی پڑی دونوں کانوں پر ہنوز ہاتھ رکھے تھی۔

''کیا ہوا زیب؟'' وہ پریشان گھبرائی ہوئیں اُس کے بستر کی پٹی پر بیٹھ گئیں۔

زیب چپ تھی۔بس سر تکیے پر پٹخ رہی تھی۔

فوزیہ اُسکا سر سہلانے لگیں۔بار بار چومتی رہیں۔

''بیٹا کچھ تو بتاؤ۔کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟'' اُن کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

اُس نے سر اٹھایا۔اور بے اختیار ماں سے لپٹ گئی۔

''امی۔'' وہ زاروقطار رودی۔

''کیا بات ہے میری جان۔'' وہ بھی اُسے لپٹا کر رونے لگیں۔

فوزیہ اُسکا سر سینے سے لگائے اُس کے رونے کی وجہ پوچھتیں اور— خود بھی روتی رہیں۔

زیب کا رونے سے کچھ دل ہلکا ہوگیا۔مگر اب بھی ماں کے سینے سے لگی رہی۔کہ وہاں اُسے سکون مل رہا تھا۔

فوزیہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔جانے اُن کی بچی کو کیا ہوگیا تھا؟ کس کی نظر لگ گئی تھی؟ اُسی کے دم قدم سے تو اِس گھر میں رونق تھی۔ورنہ تو وہ میاں بیوی تو پہلے ہی ایک بچی کا غم کھائے بیٹھے تھے۔اللہ نہ کرے اِسے کچھ ہوگیا تو؟

اُنہوں نے اُسے بمشکل چپ کرایا۔واش روم لیکر گئیں۔ہاتھ منہ دھونے کو کہا۔خود کچن میں آئیں۔اُسکے لئے ناشتہ بنایا۔اور ٹرے میں لئے دوبارہ اُس کے کمرے میں آگئیں۔

اُسے تسلیاں دیتیں، پیار کرکر کے اُنہوں نے اُسے ناشتہ کرایا۔دوائیاں بھی دیں۔اور پھر پاس ہی بیٹھی رہیں۔اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتی رہیں۔

معاً— دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ پڑوسی ڈاکٹر حنیف کی بیگم دروازے میں سے نمودار ہوئیں۔

''آئیں بھابھی آئیں۔'' فوزیہ خوش ہوتے ہوئے زیب کے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ڈاکٹر صاحب کی بیگم کو قریبی کرسی پر بٹھایا۔خود دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔

''رات حنیف بتا رہے تھے کہ زیب اچانک بے ہوش ہوگئی تھی۔میں نے سوچا دیکھ لوں آکر۔'' وہ شفقت سے زیب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''ہاں۔پتہ نہیں کیا ہوگیا تھا اِسے۔میں تو گھبرا گئی تھی۔ڈاکٹر صاحب نے آکر دیکھا۔تو کچھ تسلی ہوئی۔اس وقت تو شکر ہے بہتر ہے۔ابھی ابھی ناشتہ کرا کے دوائیاں دی ہیں۔۔۔''

''ٹھیک ہوجائے گی انشاء اللہ۔'' بیگم حنیف بولیں۔''آج کل بچوں پر stress بہت ہے۔کسی کو پڑھائی کی فکر تو کسی کو جاب کی فکر۔بچے ڈیپریشن میں جانے لگے ہیں۔'' خود اُن کے بھی

انجینئر بیٹے کو جاب نہیں مل رہی تھی۔سو وہ بھی فکرمند تھیں۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔حالات اب ہمارے جیسے نہیں رہے۔بچے واقعی tense رہنے لگے ہیں۔'' فوزیہ بستر سے اٹھنے لگیں۔''میں ذرا آپ کے لئے چائے بنا لاؤں۔''

''نہیں بھابھی۔بیٹھیں۔مجھے تو زیب کی بہت فکر تھی۔اِس لئے چلی آئی۔''

مگر— فوزیہ نہیں مانیں۔چائے بنا ہی لی۔ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔

دونوں بیٹھیں چائے بھی پی رہی تھیں۔اور باتیں بھی کر رہی تھیں۔

تبھی — زیب کو دوائیوں کے اثر سے غنودگی نے آلیا۔

''زیب بیٹی سونے لگی ہے۔'' بیگم حنیف آہستہ آہستہ کہنے لگیں۔''اچھا ہے آرام آجائے گا۔''

''ہاں۔'' فوزیہ بھی دھیرے سے بولیں۔

بیگم حنیف پندرہ بیس منٹ مزید بیٹھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بیٹھیں نا بھابھی۔'' فوزیہ نے کہا۔کہ اُن کے آنے سے انہیں بہت ڈھارس ملی تھی۔

''شام کو پھر چکر لگاؤں گی۔اِسوقت بہت کام پڑے ہیں۔یہ تو بس رہا نہیں گیا۔تو چلی آئی۔'' وہ خوش خلقی سے بولیں۔

''بہت شکریہ۔'' فوزیہ اُن کی ممنون لگ رہی تھیں۔

اٹھتے ہوئے اُن کے ساتھ گیٹ تک آئیں۔اُنہیں 'خدا حافظ' کہا۔اور— واپس زیب کے پاس آگئیں۔

زیب آہستہ آہستہ ٹھیک ہورہی تھی۔مگر ایک چُپ لگ گئی تھی اُسے۔گم سم رہتی تھی ہر وقت۔

اُس نے برائیٹن فون کر کے آصفہ کو بھی نائلہ کے فون سے آگاہ کر دیا تھا۔اپنی جو حالت ہوئی تھی اور جو اُس پر گزر رہی تھی۔وہ بھی سب بتا دیا تھا۔امی اور ابو جو اُسکی 'چپ' والی حالت سے پریشان تھے۔وہ بھی بتا دیا۔

''ہوسکتا ہے نائلہ کا یہ فون بھی بکواس ہی ہو۔تمہیں خوش تو وہ دیکھ نہیں سکتی۔بہر حال —— تم خود کو نارمل کرو۔فیاض خالو ہارٹ پیشنٹ ہیں۔اُنہیں یہ پتہ مت لگنے دو۔کہ تم پریشان ہو۔فور گوڈ سیک۔۔۔۔مجھے بہت فکر ہے تم سب کی۔''

جب زیب برائیٹن میں تھی۔تب بھی فیاض صاحب کو سینے میں درد اٹھا تھا۔ہوسپٹلائیزڈ

رہے تھے تین چار دن۔فوزیہ نے برائیٹن مین نازیہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔کہ مبادا اُن کی زبان سے بات نکل جائے اور زیب کو پتہ چل جائے۔کیونکہ وہ زیب کا ٹرپ خراب کرنا نہیں چاہتی تھیں۔خود پر جھیل لیا تھا سب۔زیب واپس آئی، اُسے بتایا۔تو بہت پریشان ہوئی تھی وہ۔

آصفہ ٹھیک کہتی تھی۔اُسے خود کو سنبھالنا ہوگا۔اور پھر —— شاید کہ نائلہ نے ایکبار پھر غلط بیانی کی ہو۔نازیہ خالہ، نواز خالو، آصفہ اور کاشف بھی اِسی مہینے پاکستان آرہے تھے۔آصفہ کی شادی کے سلسلے میں۔آصفہ نے کہا تھا۔وہ ملے گی سنگین خان سے۔تب ہی پتہ چلے گا کہ وہ واقعی وہی آدمی تھا یا نہیں جس سے زینیہ پیار کرتی تھی۔کیونکہ ایکسیڈنٹ کے بعد صرف آصفہ ہی اُسے دیکھنے ہوسپٹل گئی تھی۔وہ ہی اُسے پہچان سکتی تھی۔عجیب اتفاق تھا کہ برائیٹن میں جب بھی وہ فیملی کے ساتھ باہر نکلتی اور سنگین خان سے آمنا سامنا ہوتا۔تو اُس بار آصفہ ساتھ نہیں ہوتی تھی۔وہ سنگین خان کو دیکھ ہی نہیں پاتی تھی۔بہر حال ——

اُسے خود کو سنبھالنا چاہیے تھا۔کم از کم آصفہ کے آنے تک۔اُس کا سنگین خان کو دیکھنے تک۔اُس کے بعد کیا ہوگا؟ بے یقینی کی شکار —— وہ وقت گزارنے پر مجبور تھی!

نکاح پر تو سنگین خان موجود تھا۔لیکن اگر وہ وہی ہوتا بھی تو ابو اُسے کیسے پہچان سکتے تھے؟ کہ اُن کے تو جائے حادثہ پر پہنچنے سے پہلے ہی اُسے ہوسپٹل منتقل کر دیا گیا تھا۔وہ تو پاگلوں کی طرح وہاں گئے تھے۔اور دیوانوں کی طرح اپنی جواں سال بیٹی کی لاش اٹھائے گھر آگئے تھے۔اُس کے بعد اُنہیں اپنی خبر نہ رہی تھی۔تو اُسکی کیا خبر لیتے؟

ہاں۔آصفہ نے بعد میں بتایا تھا کہ جائے حادثہ پر موجود لوگ کہہ رہے تھے کہ زخمی آدمی ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔اور لڑکی پیچھے بیٹھی تھی۔اور بس!

نائلہ کے فون کے دو چار دن بعد اُس نے امی سے پوچھنا چاہا بھی۔کہ کیا ابو نے سنگین خان کے بارے میں کسی سے پوچھ گچھ کی تھی؟ اُسی سے ہی شاید وہ کچھ اندازہ کر لیتی۔مگر پھر ہمت نہ کر پاتی۔اگر وہ کوئی ایسی بات کہہ دیتیں۔جس سے اُسے زینیہ اور سنگین خان کی کسی لنک کا پتہ چل جاتا تو وہ برداشت نہ کر پاتی۔پھر ——

وہ چڑ جاتی۔کیا اُسے اپنے سے نکاح ہوئے شخص کا پتہ کرنے کا بھی حق نہیں تھا؟ کل کو وہ

اُسکی بیوی بننے جا رہی تھی۔ کیا اُسکا اُس کے تمام حالات معلوم کرنے کا کوئی حق نہیں بنتا تھا؟

پھر وہ تلخی سے مسکراتی۔ یہ کام خود اُس کا تھا۔ کہ اُس سے محبت کرتے وقت اُس سے اُس کے تمام حالات جان لیتی۔ کیونکہ اُس نے اُس کے حق میں بہت خوشی خوشی اپنا عندیہ دیا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط بھی اپنی مرضی سے کیئے تھے۔ نہ اُس کے حق میں 'ہاں' کرنے پر کسی نے دباؤ ڈالا تھا۔ نا ہی نکاح نامے پر دستخط کسی کے پریشر میں آ کر کیئے تھے۔ لیکن —

اُس نے اُس سے محبت کی تو نہیں تھی۔ بس ہو گئی تھی۔ اُس نے بارہا خود سے وعدے کیئے تھے۔ کہ وہ اُس سے نہیں ملے گی۔ یہ راستہ اُس کا نہیں تھا۔ نا ہی وہ اُسکی منزل تھا۔ مگر—

وہ تو کچے دھاگے سے بندھی اُسکی طرف بڑھتی گئی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اُس کی جانب چلتی چلی گئی تھی۔

انسان سوچ سمجھ کر محبت کیوں نہیں کرتا؟ وہ خود کو کوستی۔ مگر کوئی حل سمجھ میں نہ آتا۔

سنگین خان کی کالز اور میسجز اب بھی آتے تھے۔ اُسے دیکھنے کی اُسے ملنے کی بے تابی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اب تو وہ اُسکی منکوحہ تھی۔ اُسے حق تھا اُسے کسی بھی وقت یاد کرنے کا۔ باتیں کرنے کا۔

زیب کا کرب بڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے جواب بھی دیتی۔ باتیں بھی کرتی۔ مگر ذہن و دل میں جو ہلچل مچی تھی۔ وہ، وہ ہی جانتی تھی!

کبھی اُسے لگتا۔ وہ زینیہ سے لاپرواہ ہو رہی تھی۔ خود غرض بن گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنی سوچ کی تردید کرتی۔ وہ زینیہ سے لاپرواہ نہیں ہو رہی تھی۔ خود غرض نہیں بن گئی تھی۔ زینیہ تو اُسکی جان تھی۔ اُس کی بہن تھی۔ وہ کیسے ایسا کر سکتی تھی؟

سوچ سوچ کر وہ ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ کیا وہ سنگین خان سے اُسے آزاد کرنے کا مطالبہ کرے؟ طلاق لے اُس سے؟

اُف خدا! کتنا بھیانک لفظ تھا۔ لوگ کیا کہتے؟ کہ ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی۔ کہ طلاق لے لی۔ سنگین خان کے بابا کیا سوچتے؟ امی پر کیا بیتتی؟ اور ابو—

اگر ابو کو یہی بات لے ڈوبی تو؟ وہ کانپ اٹھی۔ نہیں۔ وہ یہ رسک نہیں لے سکتی تھی۔ پھر؟

کیا زینیہ کے فلرٹ امیر زادے کے ساتھ وقت گزارنا پڑے گا؟

وقت گزر رہا تھا۔ کہ وقت کبھی تھمتا نہیں۔

اُس کی زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ اُسکی ہر سانس ایک کراہ تھی۔ ہر آہ ایک طوفان!

فوزیہ نوٹ کر رہی تھیں۔ کہ زیب وہ کھلتا گلاب نہیں رہی تھی۔ جو تھوڑا عرصہ پہلے تھی۔

فیاض صاحب بھی کچھ فکر مند سے لگنے لگے تھے۔

''فوزیہ۔ زیب ٹھیک تو ہے نا؟'' آج چھٹی تھی۔ دن کے دس بج رہے تھے۔ دونوں میاں بیوی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کہ فیاض صاحب گویا ہوئے۔

''ہاں۔ ٹھیک ہے۔ کیوں؟'' اُنہوں نے پوچھا۔ جیسے پوچھ رہی ہوں۔ کہ کیا اُنہوں نے بھی وہی محسوس کیا ہے۔ جو خود اُنہوں نے نوٹ کیا ہے؟

''کچھ نہیں بس۔ جب سے اُس کے بے ہوش ہونے والا واقعہ ہوا ہے۔ اب تک جیسے اثر ہے اُس کا اُس پر۔''

''ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ کھوئی کھوئی سی بولیں۔

''کہیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے نکاح سے خوش نہ ہو۔'' اُنہوں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''نہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ وہ اپنے نکاح سے بہت خوش تھی۔ یہ تو بس۔۔۔ پتہ نہیں اچانک کیا ہوا؟ کہ وہ بے ہوش بھی ہو گئی۔ اور اُس کے بعد سے ہی گم سم بھی رہنے لگی ہے۔''

''بس اللہ رحم کرے ہم سب پر۔ خدا اُسکی قسمت اچھی کرے۔'' کچھ نہیں سمجھے تو فیاض صاحب نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی۔

''آمین۔ ثم آمین۔'' فوزیہ صدقِ دل سے بولیں۔

''اسفندیار صاحب رخصتی کے لئے بھی جلدی کر رہے ہیں۔ نئے سال کے شروع میں اِرادہ ہے اُن کا۔۔۔''

''یعنی جنوری یا فروری میں؟''

''ہاں۔ شاید جنوری میں۔''

''اب نومبر ہے۔ دسمبر اور جنوری۔ اتنی جلدی ہم تیاری کیسے کریں گے؟''

''میں نے بھی یہی کہا تھا۔ کہنے لگے۔ آپ تیاری کس چیز کی کر رہے ہیں۔ ہمیں تو صرف آپ کی بیٹی چاہیے اور بس۔''

''وہ واقعی بہت نیک انسان ہیں۔ مگر کچھ تو کرنا پڑے گا نا۔''

''کرلو جو کرنا ہے۔ مگر میرا نہیں خیال کہ وہ جنوری سے زیادہ انتظار کریں گے۔''

''نازیہ اور نواز بھائی بھی آرہے ہیں نا بمعہ بچوں کے۔۔۔''

''ہاں نواز نے مجھے بتایا ہے۔ دسمبر میں آصفہ کی شادی ہو رہی ہے۔''

''ہاں۔ دیکھیں کیسے بچے دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو گئے ہیں۔۔۔''

فیاض صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اُنہیں زینیہ یاد آ گئی۔ بولے کچھ نہیں۔ کہ فوزیہ نے سمجھ جائے۔

اور— فوزیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہ کیا وہ یہ ٹھنڈی سانس جانتی نہیں تھیں۔ یہ تو فیاض صاحب صرف زینیہ کی یاد میں لیا کرتے تھے!

''نواز کہہ رہا تھا۔ کہ دسمبر کے آخری ہفتے میں آصفہ کی شادی ہو جائے گی۔ اور ہم لوگ بھی جنوری کا مہینہ ہی رکھیں زیب کی شادی کا۔ تاکہ دونوں کام اُن کے پاکستان میں رہتے ہوئے ہی ہو جائیں۔''

''اچھا۔ پھر تو واقعی جنوری میں ہی زیب کی رخصتی کرنی چاہیے۔ وہ لوگ اتنی جلدی دوبارہ تو نہیں آسکتے۔''

''ہاں۔ اور پھر نازیہ تمہارا ہاتھ بھی بٹائے گی۔ کئی کام ہوتے ہیں ایسے موقعوں پر۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں تیاری پکڑنی چاہیے۔''

معاً— پاس ہی کمرے میں زیب کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اور دونوں نے بات کا رخ بدل دیا۔

زیب وہیں آ کر بیٹھ گئی۔ زبردستی خود پر خوشگواری طاری کی۔ اور—

اُن کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔

نواز صاحب بمعہ نازیہ اور بچوں کے کل ہی پاکستان میں اپنے آبادی گاؤں پہنچے تھے۔

آج فوزیہ، فیاض صاحب اور زیب بھی ملنے چلے گئے تھے۔ پانچ چھ میل پر ہی تو تھا نواز صاحب کا گاؤں۔

دنوں بعد بہت اچھا لگا سب۔ سبھی تو موجود تھے۔ خالہ، خالو، آصفہ، کاشف۔ اُن کے چچا، چچی اور تین کزنز بھی برائیٹن سے آئے تھے۔ دادا، دادی، باقی چچا، چچیاں اور بے شمار کزنز یہیں تھے۔ ابھی تو آصفہ کے ننھیال نے بھی اکٹھا ہونا تھا۔ بہت رونق تھی، بہت ہلچل تھی ابھی سے۔

وہ لوگ رات تک وہیں رہے۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ فوزیہ نے سب کو کل دوپہر کھانے پر اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اور—

رات گئے تینوں واپس لوٹ آئے۔

آج ایک بجے کے قریب نازیہ، نواز صاحب اور اُن کے بچوں کے علاوہ چند اور بھی دوھیال والے ساتھ آئے۔

آج زیب بھی یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ سارا دن کھانا تیار کرنے میں ماں کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ ایک بجے تک زبردست پاکستانی کھانے تیار ہوئے۔ کچھ چیزیں بازار سے بھی منگوائی گئیں۔

آج فیاض صاحب بھی دکان سے جلدی آ گئے۔ اُن کے آتے ہی زیب اور آصفہ نے کھانا میز پر لگا دیا۔

برائیٹن سے آنے والوں نے خوب خوب داد دی۔ مزے لے لے کر کھایا۔ باقی سب بھی اشتہا انگیز اور لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہوئے۔

چار بجے تک گپ شپ کرنے کے بعد سب لوگ رخصت ہو گئے۔ سوائے آصفہ کے۔

زیب اور آصفہ رات دیر تک جاگتی رہیں۔ موضوع زیادہ تر سنگین خان ہی رہا۔ جانے کیوں آصفہ کو یقین تھا۔ کہ یہ نائلہ نے خود سے گڑھا تھا۔ یہاں تک بے شک سچ تھا۔ کہ زینیہ کسی لڑکے سے پیار کرتی تھی۔ اور اُس کے ساتھ ائیر پورٹ جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں گزر گئی تھی۔ یہ نائلہ نے ضرور کسی سے سنا ہوگا۔ لیکن وہ لڑکا سنگین خان تھا۔ یہ نائلہ نے خود سے جوڑا تھا۔ بہرحال ——

زیب کی بے تحاشہ پریشانی دیکھتے ہوئے اُس کی تسلی کی خاطر اُس نے سنگین خان کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس کے کہنے پر زیب نے سنگین خان کو فون کیا۔ اور پوچھا۔ کہ کیا وہ کل یہاں آ سکتا تھا؟

''کیوں نہیں؟'' اُس نے فوراً حامی بولی۔

''دراصل آصفہ ہمارے نکاح کا ٹریٹ مانگ رہی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ میں دے دیتی ہوں لیکن وہ مُصر ہے کہ ٹریٹ آپ سے ہی لے گی۔۔۔''

"Why not." وہ جب کہیں جہاں کہیں۔ بندہ حاضر ہے۔'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''فاصلہ خاصا ہے اور آپ بہت بزی ہوتے ہیں۔ یہ یاد رہے۔''

''تو کیا ہوا؟ اِسی بہانے میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔''

پھر تینوں کی مرضی سے ایک عمدہ ریسٹورانٹ طے پایا۔ کل ہی لنچ پر۔ کیونکہ آصفہ کے ذمے بھی کئی کام تھے۔ اُس نے بھی واپس گاؤں جانا تھا۔ اور——

زیب بھی مزید کرب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پر اب —— وہ اور بھی torture میں پڑ گئی۔

سنگین وہی لڑکا نکلا تو؟

''آصفہ دعا کرو۔ وہ وہی نہ ہو۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔۔۔''

''بدفال منہ سے مت نکالو۔ نہیں ہوگا وہ وہی۔''

''اور۔۔۔ وہی ہوا تو؟''

''تو۔۔۔ تمہاری قسمت۔'' اُسے غصہ آ گیا۔ کتنی دیر سے وہ اِسی بات کو لیے بیٹھی تھی۔

''ایسا مت کہونا۔'' اُس کے لہجے میں التجا تھی۔

''دیکھو۔ وہ یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر رہتا ہے۔ اور زینیہ کا بوائے فرینڈ یہیں رہتا تھا۔ یہ بھی ایک پلس پوائنٹ ہے۔۔۔''

''ہمیں کیا پتہ کہ یہیں رہتا تھا؟''

''لگتا ایسا ہی ہے۔ باقی اللہ جانے۔ اور اب تم مزید سوچنا چھوڑ دو۔ جو قسمت میں لکھا ہوگا۔ وہی ہوگا نا۔''

''ہاں۔۔۔ ہوگا تو وہی۔'' اُس نے بھی کہا۔ اور——

آصفہ نے کروٹ مخالف سمت لے لی۔

زیب تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر——

''آصفہ۔'' اُس نے دھیرے سے آصفہ کو پکارا۔

''اب کیا ہے؟'' وہ رخ پھیر کر اُسے دیکھنے لگی۔

''دراصل۔۔۔'' اُس نے ڈرتے ڈرتے ابتدا کی۔ ''یہ بھی امیر ہے۔ وہ بھی امیر تھا۔ اِس کی بھی گرل فرینڈز رہ چکی ہیں۔ وہ بھی فلرٹ تھا۔ اِس کی بھی اپنی کزن سے منگنی ہوئی تھی۔ اُس کی بھی اپنی کزن سے منگنی ہوگئی تھی۔۔۔''

آصفہ اچانک ہنس دی۔

''زیب۔''

''جی۔''

''سنگین خان کی گرل فرینڈز تھیں تو خیر۔ اُس لڑکے کی گرل فرینڈ تھی تو وہ فلرٹ۔ بہت partial ہو یار۔''

سخت پریشان ہونے کے باوجود زیب بے ساختہ ہنس دی۔

''اور اب اسی طرح ہنستے ہنستے سو جاؤ۔ ٹھیک ہے۔'' اُس نے ایکبار پھر رخ دوسری طرف کرلیا۔

پرسوں کے سفر اور اب تک کی مصروفیات سے تھکی تھکائی آصفہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔

زیب نے بھی آنکھیں موندلیں۔

زیب کی آنکھ صبح ہی صبح کھل گئی۔ سوئی بھی کہاں تھی وہ؟

وہ واش روم گئی۔ وضو کیا۔ اور کمرے میں آکر فجر کی نماز پڑھنے لگی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تو اپنی قسمت کی بہتری کے لیے ڈھیر ساری دعائیں مانگ لیں۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ لوگ حسبِ معمول کچن میں ہی کھانا کھانے لگے تھے۔ یہیں ایک کونے میں تین کرسیاں اور چھوٹی سی گول میز ہمیشہ لگی ہوتی تھی۔ جس کا دل چاہا استعمال کرلیا۔ گو گرمیوں میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہاں سردیوں میں یہ کوزی جگہ بہت اچھی لگتی تھی۔

فوزیہ کچن میں ناشتہ بنانے کی تیاری میں لگ گئی تھیں۔ زیب بھی پاس آکر بیٹھ گئی۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کررہی تھیں۔ کہ آصفہ نہ جاگ جائے۔ اچھا تھا آرام کرلیتی کچھ۔

''امی میں اور آصفہ آج بازار جائیں گے۔ آصفہ نے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔'' یہی بہانہ ٹھیک تھا۔ آصفہ آئی ہوئی تھی۔ بہتیرے کام تھے۔ بازار تو جانا ہی تھا۔

''چلی جاؤ۔ اُس کی شادی میں تو اب دن بھی بالکل تھوڑے رہ گئے ہیں۔ ہاں میں نے بھی لِسٹ بنائی ہے۔ وہ چیزیں بھی لیتی آؤ۔ بلکہ اچھا ہے آصفہ ساتھ ہے۔ اُس کی بھی پسند بیچ میں شامل ہو جائے گی۔''

زیب میز پر ناشتے کے برتن لگانے لگی۔ فوزیہ بھی فارغ ہوگئیں۔ دونوں ناشتہ کرنے لگیں۔

زیب اِس وقت بھی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ زندگی کا تسلسل ہی کھو گیا تھا جیسے!

فوزیہ پھر پریشان ہوگئیں۔ آخر ایسی کیا بات تھی؟ جس نے اُسے مرجھا کر رکھ دیا تھا۔

شاید ماں باپ سے بچھڑنے کا دکھ تھا۔ گھر بار سے علیحدہ ہو جانے کی اُداسی تھی۔

مگر — وہ تو اور طرح کی کیفیت ہوتی ہے۔ پریشانی یا غم کی سی تو نہیں ہوتی۔ آخر تو یہی دن اُن پر بھی آئے تھے۔ سبھی لڑکیوں پر آتے ہیں۔ ماں باپ گھر بار سے علیحدگی کی اُداسی ضرور ہوتی ہے۔ مگر اُداسی غم تو نہیں بن جاتی۔ اتنی کہ۔۔۔ ماتم کرتے نظر آؤ!

''بیٹے خوش رہا کرو۔'' فوزیہ کہنے لگیں۔ ''دیکھو آصفہ کو۔ آخر اُس کی بھی تو شادی ہو رہی ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔ بلکہ تمہارا تو رشتہ بھی اُس سے کہیں زیادہ اچھے لوگوں میں ہو رہا ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ نا کہ بلکہ گم سم ہو کر رہ گئی ہو۔۔۔''

کاش امی — آپ حقیقت جان سکتیں! اُس نے ایک گہری سانس بمشکل چھپائی۔

وہ کچھ بھی تو نہیں بتا سکتی تھی امی کو۔ کیسے بتاتی۔ کہ اب اُسے سنگین خان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کیسے کہتی۔ کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیسے کہتی۔ کہ وہ ان سب ہنگاموں سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی۔ جہاں سکون ہو امن ہو اور — صرف وہ ہو۔

کوئی اور نہ ہو۔

اُس کی شادی کا ذکر نہ ہو۔

سنگین خان نہ ہو!

کیسے کہتی وہ یہ سب؟ کہ —

ابھی دو دن قبل ہی اُن کی ہی سٹریٹ میں یہی تو ہوا تھا۔ بیٹے نے منگنی ہو جانے کے بعد شادی سے عین ایک دن پہلے وہاں شادی سے انکار کر دیا۔ اور باپ کو پہلا ہی ہارٹ اٹیک ساتھ لے گیا۔

کیا ابو کی پروبلم جانتے ہوئے بھی وہ اِس رشتے سے انکار کر سکتی تھی؟ خاص طور پر جب ابو نے اُس سے اُس کی مرضی پوچھ بھی لی تھی۔ اُس نے 'ہاں' بھی کر دی تھی۔ اور تب یقیناً خوشی اُس کے چہرے کے ہر نقش میں بول رہی تھی۔ اب کس منہ سے انکار کرتی؟

اِس وقت وہ اِس قدر تناؤ میں تھی۔ کہ شاید انکار کر بھی دیتی۔ اگر ابو کو پہلے سے دل کا عارضہ نہ ہوتا۔ لیکن اب وہ یہ رِسک نہیں لے سکتی تھی۔ بیٹیاں تو پہلے بھی قربانیاں دیتی آئی ہیں۔ وہ بھی بلی چڑھ جائے گی۔ لیکن یہ کیسی قربانی تھی۔ کہ پہلے خود اُس نے ہی خوشی خوشی حامی بھر لی تھی۔ اور اب وہ ہی اِسے ایثار کا نام دے رہی تھی!

خود سے لڑتی جھگڑتی، خود پر لعن طعن کرتی، وہ ناشتہ کرنے میں مصروف تھی۔

تبھی — فیاض صاحب بھی کچن میں آ گئے۔ تیسری کرسی پر وہ بھی بیٹھ گئے۔

فوزیہ نے ناشتے کا آخری نوالہ لیا۔ اور اٹھتے ہوئے اُن کے لیے ناشتہ بنانے لگیں۔ ٹوسٹر میں دو بریڈ سلائیس گرم کیے۔ اور شہد کے ساتھ میز پر رکھ دیئے۔

وہ اور زیب چائے پینے لگیں۔ اور فیاض صاحب ناشتہ کرنے لگے۔

ناشتے سے فارغ ہوئے۔ تو فیاض صاحب دکان چلدیئے۔ فوزیہ گھر کے کاموں میں لگ گئیں۔ اور —

زیب اندر کمرے میں آ گئی۔ اپنی رائیٹنگ ٹیبل پر آئی۔ اور کتاب کھول کر سٹڈی کرنے لگی۔ آگے ٹسٹ آ رہے تھے۔ اُس نے سوچا۔ جتنا وقت ملتا ہے۔ پڑھتی جائے۔ کیونکہ آصفہ کی شادی کے ہنگاموں میں کافی وقت ضائع ہونا تھا۔

وہ دھیان دے کر پڑھنے لگی۔ دس بج گئے۔ تو اُس نے آصفہ کو جگایا۔ اُس کی تیاری میں بھی کچھ وقت لگنا تھا۔ پھر آصفہ کی نہ سہی امی نے جو شوپنگ کی لِسٹ دی تھی۔ وہ تو چیزیں خریدنی ہی

تھیں۔تب تک لنچ کا ٹائم ہو جاتا تھا۔

دونوں جلدی جلدی تیار ہوئیں۔اور گھر سے نکلتے ہوئے بس سٹاپ پر آ گئیں۔تھوڑی ہی دیر میں بس آئی۔اور وہ دونوں اُس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔

اپنی مطلوبہ چیزیں خریدتے خریدتے اُنہیں واقعی ایک بج گیا۔وہیں بازار کے قریب ہی زیب کی کلاس فیلو کا گھر تھا۔اُنہوں نے چیزیں وہیں رکھیں۔اور— ریسٹورانٹ چلدیں۔

سنگین خان نے کہا تھا۔وہ ایک بجے ریسٹورانٹ میں اُن کا منتظر ہوگا۔اور— اب وہ دونوں ریسٹورانٹ کے دروازے پر تھیں۔

زیب کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔اتنا — کہ لگتا تھا پنجر توڑ کر باہر آ جائے گا۔

''زیب۔خود کو سنبھالو۔لوگ ہیں اندر۔کیا سوچیں گے؟''اُس کا فق ہوتا چہرہ دیکھ کر آصفہ بھی پریشان ہو گئی۔

اُس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔خود کو زبردستی نارمل کیا۔اور— دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

دونوں نے ایک اچٹتی نظر ہال پر ڈالی۔

اور— آصفہ کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔

اُس پار کونے والی ٹیبل پر زینیہ کا بوائے فرینڈ بیٹھا تھا۔

وہی تھا۔وہ اُسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ایکسیڈنٹ کے تیسرے دن وہ صرف اِسے ہی تو دیکھنے گئی تھی ہوسپٹل۔کہ زینیہ کی جان لینے والا چیز کیا تھا؟سو رہا تھا اُس وقت۔اور جاگ رہا تھا اِس وقت بس یہی فرق تھا اُس میں اور اِس میں!

''وہ بیٹھا ہے سنگین۔''زیب کا اشارہ بھی اُسی کی طرف تھا۔

اور— آصفہ نے لمحے میں ہی فیصلہ کر لیا۔وہ زیب کو نہیں بتائے گی۔کہ یہی زینیہ کا بوائے فرینڈ تھا۔دنوں میں ہی اُس کی اُس کے ساتھ شادی ہونے والی تھی۔ایسے میں حقیقت بتا کر وہ اُس کو اور فیاض خالو کو تباہی میں گھسیٹنا نہیں چاہتی تھی۔وہ زینیہ کا بوائے فرینڈ تھا۔تو تھا۔اب زیب کا شوہر تھا۔اور وہ اُس سے محبت کرتی تھی۔سچ بتا کر وہ اُس کے خوابوں کے محل چکنا چور نہیں ہونے دے گی۔

اُس نے با کمال صفائی خود کو سنبھالا۔

زیب نے آصفہ کی طرف دیکھا۔اُس کا ردِعمل دیکھنے۔مگر— وہاں کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

''وہی تو نہیں نا؟''زیب کو جیسے کچھ اُمید سی آ چلی تھی۔پھر بھی آواز میں بے یقینی کا خوف اپنی جگہ تھا۔

''وہ جو کونے والی ٹیبل پر بیٹھا ہے؟''وہ انجان سی بنتے ہوئے بولی۔

''ہاں وہی۔''

''نہیں یار۔۔تم نے تو میری جان نکال دی تھی۔''وہ بہت casually بولی۔''آؤ چلیں اُس کے پاس۔''

اوہ — زیب نے نجات کی سانس لی۔پچھلے کئی دنوں کا گراں بار سر سے اُترنے لگا۔تو آنکھیں نم ہو گئیں۔

''زیب اب تو ٹھیک ہو جاؤ پلیز!''

''میں ٹھیک ہوں۔''اُس کی آواز میں زندگی عود کر آئی تھی۔

پھر— وہ دونوں سنگین خان کی ٹیبل پر آ گئیں۔

سنگین خان تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا۔قیمتی ڈارک گرے سوٹ میں ملبوس،مسحور کن پرسنیلٹی لئے وہ واقعی کوئی گریک گوڈ لگ رہا تھا۔

''یہ آصفہ ہے میری کزن۔''زیب نے دھیرے سے کہا۔

''ہیلو۔''سنگین خان متانت سے بولا۔

''ہائے۔''آصفہ مرعوب سی بولی۔

''گڈ ٹون میم۔''اب کے اُس نے زیب سے کہا۔لہجے میں شرارت تھی۔آنکھوں میں شوخی۔

زیب نکاح کے بعد آج پہلی بار اُس سے مل رہی تھی۔بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہوئی جا رہی تھی۔اُس کے شوخ و شنگ لہجے نے مزید سرخ بنا دیا۔

''ہائے۔'' وہ بمشکل بولی۔

وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ تو سنگین خان بھی بیٹھ گیا۔

پھر— تینوں کی پسند کا کھانا آ گیا۔

دلچسپ باتوں کے دوران وہ لوگ کھانا کھانے لگے۔

زیادہ تر باتیں آصفہ اور سنگین خان ہی کرتے رہے۔ کہ زیب کی شرم آج کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

''آپ کی کزن زبان گھر میں چھوڑ آئی ہے کیا؟'' زیب کو شریر نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے آصفہ سے چھوڑا۔

''ایسا ہی لگتا ہے۔ زیب تم بھی کچھ بولو نا۔'' آصفہ نے زیب سے کہا۔۔۔ بس میں ہی بولے جا رہی ہوں اتنی دیر سے۔''

زیب نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ہولے سے مسکرائی۔ اور— پھر اپنی پلیٹ پر نظریں جما دیں۔

''یہ بعد میں بولے گی سنگین بھائی۔ اور پھر اتنا بولے گی۔ کہ آپ تنگ آ جائیں گے۔'' آصفہ نے کہا۔ کہ—

زیب واقعی بہت گپ شپ کرتی تھی۔ بہت دلچسپ باتیں کرتی تھی۔

''اچھا؟'' یہ بات اُس کے لیے نئی تھی۔ زیب نے پہلے بھی کبھی کھل کر اُس سے باتیں نہیں کی تھیں۔ ''I'm lucky then میں خود زیادہ نہیں بولتا۔ اچھا ہے مجھے انٹرسٹنگ کمپنی دے گی۔'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''صرف باتیں ہی نہیں۔ یہ انٹرٹین بھی کرے گی۔ بہت انٹرسٹنگ چیز ہے میری کزن۔''

آصفہ کے لب و لہجہ میں زیب کے لیے ڈھیر ساری محبت تھی۔

"Is she right?" وہ اُسے اڈورنگ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

زیب نے لمبی خمیدہ پلکیں اوپر اُٹھائیں۔ ایک پل کو اُس کی طرف دیکھا۔

اُس کی نظروں میں کہانیاں تھیں، داستانیں تھیں۔

اُس کی پلکیں تیورا کر گر گئیں۔ زبان نے ایک بار پھر ساتھ نہیں دیا۔

سنگین خان محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

پھر— اُس نے دیکھا۔ وہ کھانا بھی برائے نام ہی کھا رہی تھی۔

اُس نے اپنی پلیٹ میں سے کانٹے سے چکن کا پیس لیا۔ اور اُس کے منہ کے پاس لے گیا۔

"Open your mouth—Open wide". وہ پیار سے کہہ رہا تھا۔

زیب نے منہ کھول دیا۔ اور— پیس لے لیا۔

''بس اِس کو آپ ایسے ہی کھلائیں۔ ورنہ بھوکی رہ جائے گی۔'' آصفہ کو سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''میں خود کھالوں گی۔'' زیب مجبوراً بول ہی اٹھی۔

آصفہ اور سنگین خان دونوں ہی مسکرا دیئے۔

یوں ہی زیب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے تینوں کھانے میں مصروف تھے۔

بظاہر اتنا اچھا یہ آدمی کتنے بُرے کرتوت کا حامل تھا۔ عورتیں، شراب اور جانے کیا کیا؟

آصفہ نے پل بھر کو سوچا۔ اور— ہوش و حواس کی دنیا میں آ گئی۔

زیبیہ کو اس نے کتنا تڑپایا تھا۔ یہ پھول پھول سونگھنے کا عادی تھا۔ اور وہ اِسے اپنے من مندر میں سجانے کی خواہش مند تھی۔ جان دے دی بچاری نے اِسے خوش کرتے کرتے۔۔۔

وہ تلخی سے مسکرائی۔ پھر—

سر جھٹکا۔ اور— دوبارہ سے اپنے جھوٹ کا ساتھ دینے لگی۔ کہ اِس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ شادی سر پر۔ اور بات طلاق کی۔ ایسا وہ کیسے ہونے دیتی؟

وہ اب بھی سنگین خان کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ زیب کو چھیڑ رہی تھی۔ مگر— کچھ بجھ سی گئی تھی۔

کھانے کے بعد وہ لوگ کچھ دیر وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر—

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ریسٹورانٹ سے باہر نکل آئے۔ سنگین خان کی گاڑی تک آ گئے۔

''آئیں۔ میں آپ دونوں کو چھوڑ آتا ہوں۔'' سنگین خان نے پیشکش کی۔

''نو تھینکس۔ ہم نے کچھ شوپنگ کرنی ہے۔ بعد میں خود ہی چلے جائیں گے۔ And "thanks for the nice lunch". آصفہ نے ٹریٹ دینے پر اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"You're welcome". سنگین خان نے کہا۔ اور —

پاس کھڑی زیب کی چھوٹی سی پیاری سی ناک کو انگلی سے چھیڑا۔

نظریں اٹھا کر اُس نے اُسے دیکھا۔

پل میں ہی اُس نے اُسے شریری سی وِنک دی۔

"Bye" وہ بولا۔

گھبرا کر زیب نے آصفہ کی طرف دیکھا۔ مگر — وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

"Bye" وہ دھیرے سے بولی۔

پھر — سنگین خان نے دونوں سے اجازت لی۔ اور —

اپنے شہر کے لیے چل پڑا۔

آصفہ آج اِدھر ہی تھی۔ فوزیہ خوش تھیں۔ بہن اور اُس کے بچوں کے آجانے سے رونق ہو گئی تھی۔ اور — عجیب سی بات تھی۔ کہ عرصہ بعد زیب کا خوبصورت چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ باتوں میں خوشیوں کی جھنکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

کیا آصفہ کے آنے کی اُسے اتنی خوشی ہوئی تھی۔ کہ چہرہ کِھل اُٹھا تھا۔ آواز میں جانجھر بج اُٹھے تھے۔ لیکن —

اگر ایسا تھا۔ تو پھر کل وہ اتنی کِھلی کِھلی کیوں نہیں تھی؟ آج صبح تک کیوں اُس کے چہرے پر گہری اُداسی کی چھاپ تھی؟

کچھ نہیں سمجھ پائیں۔ تو اُنہوں نے خیال جھٹک دیا۔ وہ خوش تھی، یہی کافی تھا۔

شام چائے کے بعد فوزیہ بھی زیب اور آصفہ کے ساتھ اُن کے کمرے میں ہیٹر کے قریب نیچے کارپٹ پر آبیٹھیں۔

سردی اپنے عروج پر تھی۔ دن جیسے سُکڑ کر رہ گئے تھے۔ اِدھر دن نکلا، اُدھر شام ہوئی۔ گلابی جاڑے بہت خوبصورت تھے۔

زیب اِس وقت بھی چہک رہی تھی۔ فوزیہ اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ اور —

آصفہ دونوں کو دیکھتے دیکھتے سوچ رہی تھی۔ اتنی زبردست پرسنیلٹی، اتنا بردبار، اتنی دلفریب باتیں کرنے والا آدمی — دل میں اندھیرے چھپائے منہ پر اُجالے لیے اب شاید زیب کے لاثانی حسن کا اسیر ہو گیا تھا۔ لیکن —

کیا وہ ہمیشہ اُس کا ساتھ دے سکے گا؟

کیا آئندہ کے لیے شراب اور عورت سے کھیلنا چھوڑ دے گا؟

ایک شرابی اور وومنائیزر اپنی عادتیں چھوڑ دے۔ یہ اُس نے کبھی سُنا نہیں تھا۔

اور پھر زیب کو تو اُس سے اِس لیے نفرت تھی۔ کہ اُس نے اُس کی بہن کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ کسی اور لڑکی میں دلچسپی لینے کے باوجود اُسے اُس کو سی آف کرنے ائیرپورٹ تک ساتھ جانے کو کہا تھا۔ ٹھکرائے جانے کے باوجود وہ ساتھ چل دی تھی۔ کہ سمندر میں سے قطرہ سہی، کچھ تو وہ دے رہا تھا اُسے۔

اور — اِسی قطرے کی خیرات لیتے لیتے وہ اِس دنیا سے اُٹھ گئی!

کیا اُس نے حقیقت نہ بتا کر اچھا کیا؟ آصفہ نے خود سے سوال کیا۔

لیکن — طلاق؟ دوسرے لفظوں میں فیاض خالو کی ممکنہ موت؟

بہت بھیانک تھا سب کچھ۔ اُس نے سر جھٹکا۔

اگر دروغِ مصلحت میں ہی سب کی خوشی تھی۔ تو اُس نے ٹھیک کیا تھا۔

لیکن — اُسے بعد میں پتہ چل گیا تو؟

کیا وہ خود آصفہ کو معاف کرے گی؟

'آصفہ دعا کرو۔ وہ وہی نہ ہو۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔'

اُس کے کانوں میں رات کے کہے زیب کے الفاظ گونجے۔ اور وہ — کانپ کر رہ گئی۔

''بدفال منہ سے مت نکالو۔ نہیں ہو گا وہ وہی۔'' اُس نے کہا تھا۔

''اور۔۔۔وہی ہوا تو؟''

تو۔۔۔تمہاری قسمت۔'' اُسے غصہ آ گیا تھا۔

اُس کی قسمت نہیں۔قسمت تو اب وہ بنانے جا رہی تھی اُس کی!

غلط بیانی سے کام لیکر اُسے دھوکے میں رکھ رہی تھی!

ایک ایسے آدمی سے اُس کی شادی ہونے دے رہی تھی۔ جس سے اُسے ایک عرصہ سے بے پناہ نفرت رہی تھی!

اچانک اُسے ہنستی مسکراتی زیب — شادی کے بعد ایک چلتی پھرتی لاش کی مانند دکھائی دی۔اور —

اُس کا حلق سوکھنے لگا۔دم گھٹنے سا لگا۔

دل چاہا۔چیخ چیخ کر بتا دے اُسے۔کہ وہ وہی تھا۔وہی تھا۔۔۔

وہ جلدی سے اُٹھی۔کمرے سے باہر نکلی۔اور کچن میں جا کر پانی کا پورا گلاس ایک ہی سانس میں پی گئی۔

اوہ — وہ وہیں ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئی۔سر ٹیبل پر ٹکا دیا۔

تبھی — زیب اُس کے پیچھے آ گئی۔

''کیا بات ہے آصفہ؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟'' اُس کے یوں اچانک اُٹھ آنے پر اُس نے تشویش سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اُس نے سر اُٹھایا۔مسکرانے کی کوشش کی۔''تھکاوٹ ہے نا بہت سخت۔ چکر سا آ گیا تھا۔''

''اوہ۔واقعی۔جب سے آئی ہو۔ریسٹ تو کیا نہیں۔بلکہ میں نے ہی ریسٹ کرنے نہیں دیا۔چلو آؤ۔بستر پر لیٹو۔'' اُس نے اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اُٹھایا۔اور بستر پر لے آئی۔

''تھک گئی ہے میری بچی۔'' فوزیہ اُس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''امی آپ اِس کا خیال رکھیں۔میں اِس کے لیے انرجائل بنا کر لاتی ہوں۔زیب بولی۔

اور —

کچن میں آ کر جلدی جلدی اُس کے لیے انرجائل بنائی۔تھوڑی ہی دیر میں اُس نے اُسے انرجائل کا گلاس پکڑایا۔

''یہ لو۔تم بہت تھک گئی ہو۔اِس لیے چکر آ گیا تھا۔'' پھر وہ ماں کی طرف دیکھنے لگی۔''امی آج کھانا جلدی کھا لیتے ہیں۔آصفہ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

''ہاں بالکل۔'' اُنہوں نے اُس کی تائید کی۔

پھر — رات کو کھانا اُنہوں نے جلدی ہی کھا لیا۔

دونوں کزنز نے آج دیر تک باتیں بھی نہیں کیں۔

زیب مطمئن تھی،خوش تھی۔آرام سے سو گئی۔

جبکہ — آصفہ بے کل تھی،پریشان تھی۔دیر تک خود سے لڑتی رہی۔پھر جانے کس پہر آنکھ لگ گئی۔

پچھلا پورا ہفتہ گاؤں میں آصفہ کی شادی کی تیاریوں اور پھر اُس کی مہندی اور بارات کی گہما گہمی میں گزر گیا۔ آصفہ انوکھی اور خوبصورت رسموں کے ساتھ پیا کے دیس سدھار گئی۔ پیا کا دیس دور نہیں تھا۔ پر — بسا اوقات حکومتوں میں فاصلے بڑھ جاتے تھے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی عواموں کے دل بجھ جاتے تھے۔

یہی پاکستان اور انڈیا کے باسی جب کبھی باہر ممالک میں اکٹھے ہوتے۔ تو بہترین دوست ہوتے ایک دوسرے کے۔ حکومتوں کی پالیسیز حکومتیں ہی جانیں کے مصداق وہ لوگ اُس طرف سے آنکھ کان بند کیے آپس میں گھل مل کر پیار محبت سے رہا کرتے تھے۔

کچھ یہی حال آصفہ اور ابرار کا بھی تھا۔ اُن کی شادی میں انڈیا سے ابرار کے صرف

مسلمان دوست نہیں بلکہ کئی ہندو دوست بھی آئے تھے۔ اُن کی فیملیز بھی آئی تھیں۔ اور نازیہ اور نواز صاحب نے اُنہیں سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ رخصت ہوتے وقت پاکستان کے خاص تحفے تحائف کے ساتھ روانہ کیا تھا۔

بہت رونق تھی پورا ہفتہ۔ پھر — آصفہ ابرار کے ساتھ اپنے سسرال چل دی۔ سسرال — جو نزدیک بھی تھی۔ اور — دور بھی!

زیب کو لگا۔ وہ بہت اکیلی رہ گئی تھی۔ اُداس بھی تھی۔ وہی — کہ سسرال شاید دوسرے ملک میں تھی۔ بہر حال —

تھکی تھکائی شام کو امی ابو کے ساتھ گھر پہنچی۔ تو گاؤں، رشتہ داروں اور پورے ہفتے کی چہل پہل بہت یاد آئی۔ مگر اُس کی اور ابو دونوں کی کل یونیورسٹی اور دکان پر حاضری ضروری تھی۔ دونوں ہی مزید چھٹی نہیں کر سکتے تھے۔

رات کھانے کے بعد وہ کوئی سٹڈی وغیرہ کیے بغیر ہی بستر میں گھس گئی۔ کیونکہ ہفتے بھر سے آرام نہیں کیا تھا۔

غنودگی طاری ہونے کو تھی۔ کہ سنگین خان کی کال آ گئی۔

''میں نے نیند سے تو نہیں جگایا؟'' اُسے شبہ گزرا۔ کہ شاید وہ نیند میں تھی۔

''نہیں۔ بس۔۔۔ سونے کو تھی۔''

''اچھا سو جاؤ۔'' وہ محبت سے بولا۔ ''لیکن کل مجھے ملو۔ میں آ رہا ہوں۔ پتہ ہے کتنی یاد آ رہی ہو؟''

''کتنی یاد آ رہی ہوں؟'' اُس نے چھیڑا۔

''کہ اگر کل مجھے نہیں ملیں۔ تو میں وہیں تمہارے گھر کے آگے ہنگر سٹرائیک کر کے بیٹھ جاؤں گا۔''

''میں۔۔۔ کیسے ملوں؟'' دل تو اُس کا بھی چاہتا تھا اُسے دیکھنے کو۔ مگر۔۔۔

''جیسے اُس دن ملی تھیں۔''

''لیکن ابو کو پتہ چل گیا تو؟''

''نہیں چلے گا پتہ۔اور چل بھی گیا۔تو میں کہہ دوں گا۔کہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔اور پلیز زیادہ پابندیاں مت لگائیں۔ورنہ میں اِس لڑکی کو اُٹھا کر لے جاؤں گا۔۔۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اور آگے سے تم اپنی enchanting ہنسی سے مجھ پر جادو بھی کر رہی ہو۔۔۔''

''اچھا مل لوں گی۔زیادہ شور مت مچائیں۔''

اور — سنگین خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''اچھا — سناؤ کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اور کیسی ہو؟''

''اور بھی ٹھیک ہوں۔''

''اور۔۔۔کیسی ہو؟'' وہ کبھی کبھی یوں ہی دہرایا کرتا تھا۔

''اور۔۔۔بھی ٹھیک ہوں۔'' وہ حسبِ سابق بولی۔

''اچھا تمہاری آنکھیں کیسی ہیں؟''

''جیسے ہمیشہ ہوتی ہیں۔''

"Intoxicating?"

''پتہ نہیں۔'' اُسے ہنسی آ گئی۔

''پتہ کرو نا۔''

''کر لیا۔''

''کیا کہتی ہیں؟''

''یہی کہ یہ تو آپ ہی دیکھ کر بتا سکتے ہیں۔۔۔''

''اوہ — اِس کا مطلب ہے میری آنکھوں کا حال بھی تم ہی جانتی ہو۔۔۔''

''ظاہر ہے۔''

''وہ کیا کہتی ہیں؟''

''پھر بتاؤں گی۔'' وہ کیا کہتی۔کہ وہ تو ہر دم بولتی رہتی تھیں۔یاد دہانیاں کراتی رہتی تھیں۔

''نہیں ابھی۔''

''نہیں پھر۔''

''ابھی۔''

''نو۔''

''ٹھیک ہے میں نہیں بولتا۔'' وہ واقعی چپ کر گیا۔

''ہیلو۔'' زیب بولی۔

کوئی جواب نہیں تھا۔

''ہیلو۔'' وہ پھر بولی۔

اب بھی خاموشی تھی وہاں۔

''ہیلو سَر!''

اب بھی چپ۔

"I love you." زیب کو اُس کے روٹھنے پر پیار آنے لگا۔

"Me too." اُس کی روٹھی روٹھی سی آواز آئی۔

زیب کو اُس پر اور بھی پیار آیا۔

''اچھا بتائیں کل کہاں ملوں؟''

اُس نے گہری سانس لی۔

''اُسی ریسٹورانٹ کے پاس۔بیٹھنا نہیں ہے ہم نے وہاں۔لونگ ڈرائیو پر جائیں گے۔''

''مجھے مروائیں گے آپ کسی دن۔''

''نہیں مرواؤں گا۔''

''مجھے کسی نے دیکھ لیا آپ کے ساتھ تو؟''

''کیا ہوگا۔زیادہ سے زیادہ پولیس سٹیشن میں رپورٹ درج کرا دیں گے۔میں نکاح نامہ

دکھا دوں گا۔ تو سب شرمندہ ہو جائیں گے۔

نکاح کے بعد وہ اِسی قسم کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ اُسے اچھا لگتا تھا یہ سب!

رات گئے تک دونوں کی یوں ہی آپس میں نوک جھونک چلتی رہی۔

''صاحب جی۔'' وہ اِسی طرح کبھی اُسے 'سر' کبھی 'صاحب جی' کہہ کر بلاتی تھی۔

''ہوں۔'' سنگین خان کو بھی بہت اچھا لگتا تھا اُس کا تخاطب۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔ اب سو جاؤں؟''

''اوہ — ہاں۔ پلیز!''

رات کافی ہو گئی تھی۔ اُسے فون بند کر دینا چاہیے تھا اب۔

''گڈ نائیٹ۔'' زیب بولی۔

''گڈ نائیٹ۔'' سنگین خان نے بھی کہا۔ اور —

فون بند کر دیا۔

سردی زوروں پر تھی۔ دھوپ کانپ ٹھٹھر رہی تھی۔ پھر بھی — سیندوری جاڑے سحر جگا رہے تھے۔

زیب وعدے کے مطابق سنگین خان سے ملنے مقررہ جگہ پر آ گئی۔ سنگین خان ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ پہلے سے ہی طے کیے ریسٹورانٹ کی پارکنگ میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اُس کا منتظر تھا۔

وہ آ کر بیٹھ گئی۔ تو اُس نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

مختلف موڑ موڑتا وہ رَش سے باہر آ گیا۔ وہ اِس شہر سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ گو یہاں سے گزر ضرور ہوا تھا۔ لیکن راستوں کا کوئی خاص علم نہیں تھا۔ پھر بھی — بآسانی مین روڈ پر آ گیا۔ آگے ہی آگے چلتا رہا۔

چھوٹا سا قدیم شہر تھا۔ کوئی نیا کام جیسے ہوا ہی نہیں تھا۔ وہی پرانی عمارتیں تھیں، وہی گزرے وقتوں کی سڑکیں۔ اپنی قدامت کی وجہ سے ہی الگ سی شناخت لیے تھا۔

اب وہ دائیں جانب برانچ روڈ پر ہولیا۔ دورویہ چناروں کے بیچ چلتی سڑک پر زیب کے سر کا حسین بوجھ کندھے پر لیے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

''زیب۔'' اُس کے خوبصورت ماتھے کو اپنے پرکشش ہونٹوں سے چھوتے ہوئے وہ ہولے سے بولا۔

''جی۔'' اُس نے سر اُٹھایا۔

''جلدی سے آجاؤ نا میرے پاس۔'' وہ اُس کی سرخی مائل سنہری آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے بولا۔

اُس کی جھالریں پلکیں جھک گئیں۔ رنگ سرخ ہوگیا۔

اتنی بار ملنے کے باوجود— نکاح کے بعد سے وہ اُس کا سامنا بمشکل کر پا رہی تھی۔

''آپ کے پاس تو ہوں۔''

''ایسے نہیں۔ میرے گھر میں۔ سب کے سامنے۔۔۔''

''آپ لے جائیں نا۔ میں نے منع تو نہیں کیا۔''

''یہ — رسمیں بھی عجیب چیز ہیں۔ باقاعدہ نکاح ہوچکا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم آزادی سے مل جل نہیں سکتے۔

وہ اُس کی بے تابی پر مسکرادی۔ دھیرے سے۔

''ویسے — سوچتا ہوں تو یہی زندگی کا حسن ہے۔'' وہ پھر کہنے لگا۔ ''پابندی نہ ہوتو آزادی کا مزا کیسے آئے؟ کبھی کبھی مجھے تم سے بآسانی نہ ملنے پر جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ اِس کے باوجود اپنی مشرقی رسمیں اچھی بھی لگتی ہیں۔۔۔''

وہ سنتی رہی۔ اُس کو تکتی رہی۔

سنگین خان نے ایک پل کو اُس کی طرف دیکھا۔ پھر — باری باری اُس کی دونوں آنکھوں پر پیار کرلیا۔

"I'm so lucky — you are mine now" اُس نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

دھیمی رفتار سے چلتا رہا۔

''بائے دا وے۔ آج کیا بہانہ کرکے نکلی ہو گھر سے؟'' اُس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''آج بہانہ نہیں کیا۔''

''کیا مطلب؟'' اُسے حیرت سی بھی ہوئی۔

''بس امی کو رازدار بنالیا۔''

''اوہ نو۔''

''میں نے سوچا۔ ہمیں ذرا بھی دیر ہوگئی۔ تو وہ گھبرا جائیں گی۔ فوراً فون پر میری فرینڈز سے پتہ کرنے لگ جائیں گی۔ اِس طرح پتہ نہیں فرینڈز کیا سوچتیں۔ سو میں نے امی سے کہہ ہی دیا۔ کہ آپ مجھ سے ملنے آرہے ہیں۔ پہلے تو منع کردیا۔ پھر کہنے لگیں۔ چلی جاؤ لیکن جلدی آجانا۔۔۔''

''جلدی — دیکھیں گے۔'' اُس کی آنکھوں می شرارت تھی۔

''جلدی تو آئیں گے۔'' زیب اُس کے ارادوں پر مسکرادی۔

''آج کا دن میرا ہے۔ میں جب بھی واپس آؤں۔'' کچھ اُسے زیب کی امی کی طرف سے بھی تسلی ہوگئی تھی۔

''پلیز!''

''شام تک آئیں گے واپس۔'' اُس کا لہجہ اٹل تھا۔

''اندھیرا ہونے سے پہلے۔'' اُس کے بھی لہجے میں استحکام تھا۔

''کیوں اندھیرے سے ڈر لگتا ہے؟ میں ساتھ ہوں نا''

وہ چپکے سے مسکرادی۔ کیا کہتی۔ کہ امی نے اُسی سے تو وارن کیا تھا!

یوں ہی دلچسپ باتوں کے دوران وہ یہاں وہاں چلتے چلے گئے۔

لنچ ٹائم ہوا۔ تو کھانے کی تلاش میں نکل گئے۔ ایک بیکری نظر آئی۔ اُس سے سینڈوچز خریدے۔ اور کھاتے کھاتے آگے بڑھنے لگے۔

کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے زیب کا شہر۔شام ہونے سے پہلے وہ دونوں ایک خوبصورت پارک میں آ گئے۔

پارک کی کینٹین سے ڈسپوزیبل کپس میں چائے لی۔اور ایک الگ تھلگ سے بینچ پر آ کر بیٹھ گئے۔

بچے، جوان، بوڑھے سبھی تو تھے۔رونق انجوئے کرتے، گپ شپ کرتے وہ دونوں چائے پیتے رہے۔

مختصر سے تو دن تھے۔جلدی ہی سورج دیوتا اپنی پناہ گاہ کی جانب بڑھنے لگا۔

''اب چلیں؟''زیب چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی بولی۔

سنگین خان نے گہری سانس لی۔اُس کے ہاتھ سے خالی کپ لیا اور — کچھ فاصلے پر پڑے ڈسٹ بن میں دونوں کپ ڈال آیا۔

''چلو میم۔''

گو اُس کا خیال جانے کو بالکل نہیں کر رہا تھا۔مگر— زیب کا وقت پر گھر پہنچنا ضروری تھا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھے۔اور واپس اُسی سڑک پر جانے لگے۔

زیب کو اُس سے وہ اور بھی اچھا لگنے لگا۔کبھی اُسے مشکل میں نہیں ڈالا تھا۔کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔

''آپ بہت اچھے ہیں سر۔''وہ دھیرے سے بولی۔

''تمہیں آج پتہ چلا؟''

''نہیں سر۔میں آپ کو کافی دنوں سے جانتی ہوں۔''

سنگین خان نے اُسے اپنے بازو میں لے لیا۔اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی میں تمہیں کیسے پیار کروں۔کتنا پیار کروں۔تمہیں میرے پیار کا اندازہ نہیں۔ "You can't imagine my fathomless love..." اُسے پیار کرتے کرتے وہ کہہ رہا تھا۔

وہ گم تھی۔اُس کے چوڑے سینے میں۔اُس کے دل کی دھڑکنوں میں۔اُس کی گرم مہکتی سانسوں میں۔

ایک دوسرے میں کھوئے وہ واپس شہر میں آ گئے تھے۔

زیب سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔سنگین خان نے بھی توجہ سڑک پر مرکوز کر لی تھی۔کہ وہ اِس شہر کے راستوں سے واقف نہیں تھا۔اِس بار شاید وہ کسی اور روڈ پر اِس کے علاقے میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تبھی — زیب نے دیکھا کچھ آگے وہی ایریا تھا۔جہاں اُن کا پرانا گھر واقع تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔معاً چونکا۔

''اوہ گوڈ! کچھ عرصہ قبل اِس جگہ میرا ایک خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔۔۔''اُس نے پاس ہی اُس جگہ کی طرف اِشارہ کیا۔

زیب کی آنکھیں پھیل کر رہ گئیں۔دہشت طاری ہو گئی اُس پر!

یہ وہی جگہ تھی۔جہاں زینیہ کا اُس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

سنگین خان نے اُس جگہ سے گزرتے گزرتے گاڑی کی رفتار بالکل دھیمی کر لی تھی۔برابر اُسی سپاٹ کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔''

''ہاں۔''وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

''وہ لڑکی مر گئی تھی۔اور آپ زخمی ہو کر ہوسپٹل پہنچ گئے تھے۔۔۔''

''ہاں۔لیکن تم — تم کیسے جانتی ہو یہ سب؟''

اُس کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔زیب کو اُس کا رنگ بدلتا محسوس ہوا۔

''کیونکہ وہ میری بہن تھی۔زینیہ تھی۔''وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔پھر—

ایک عرصہ سے اِس شخص کے خلاف اُس کے ذہن و دل میں بر پالا وا اُبل ہی پڑا۔

''مجھے نفرت ہے تم سے۔"I hate you"وہ ہزیانی انداز میں چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

بھول گئی تھی سارے آداب۔بھول گئی تھی باپ کے دل کا عارضہ بھی۔بس یاد رہی تو زینیہ

کی بے بسی کی موت!

آخر تو وہ شخص اُس کے ہاتھ آ ہی گیا تھا۔جس کی وجہ سے وہ سب بے موت مرے جا رہے تھے!

سنگین خان نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ پچھتایا۔کہ وہ اِس راستے سے آیا ہی کیوں؟

''سنو۔'' وہ پہلی بار گویا ہوا۔

''شٹ اَپ۔ مجھے آزاد کر دو۔ میں ایک پل بھی تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں۔نفرت۔سُنا تم نے؟'' وہ اُسی ہسٹیرک کیفیت میں بولی۔ساتھ ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی۔

سنگین خان نے اُس کا وہی ہاتھ پکڑ لیا۔اور— زیب کو جیسے کرنٹ چھو گیا۔

''مت چھوؤ مجھے۔'' وہ چلائی۔ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

وہ کہنا چاہتا تھا اُسے۔کہ اُس کی بہن کو اُس نے تو نہیں مارا تھا۔خود قضا آئی تھی اُس کی۔

لیکن وہ کچھ سنتی تو وہ کہتا!

''اچھا بیٹھو۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' اُس کی حالت دیکھتے ہوئے اُسے یہی مناسب لگا۔

''نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ۔۔۔''

اُس کی اَن سُنی کرتے ہوئے سنگین خان نے لاکس لگائے۔اور گاڑی چلا دی۔

وہ پاگل سی ہوتی بیٹھی رہی۔اور—

سنگین خان اِدھر اُدھر گاڑی دوڑاتا اُس کے علاقے تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔

آخر کار— اُس کے گھر کو جاتی سٹریٹ نظر آ ہی گئی۔

اُس نے ہاتھ ایک بار پھر دروازے کے ہینڈل پر رکھ دیا۔

اب کے سنگین خان نے خاموشی سے گاڑی روک دی۔اُس کا بھی موڈ آف ہو چلا تھا۔

کچھ بھی کہے سنے بنا وہ اُتر گئی۔اور— اپنے گھر کی طرف چل دی۔

سنگین خان واپس گھر آ چکا تھا۔آفس بھی جانے لگا تھا۔مگر تھا خاصا اَپ سیٹ۔

زینیہ زیب کی بہن تھی۔ یہ انکشاف واقعی پریشان کن تھا۔ وہ اُس کے ساتھ ائیر پورٹ جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئی تھی۔عرصہ بعد تمام واقعہ اُس کی نظروں میں پھر سے گھومنے لگا تھا۔

ایک دو دن اُس نے زیب کو کونٹیکٹ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔وہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گی۔تو بات کرے گا اُس سے۔آخر تو اُس نے زینیہ کو جان بوجھ کر تو نہیں مارا تھا۔قسمت میں جو لکھا تھا۔وہ تو ہو کر رہنا تھا۔وہ تو گاڑی بھی خود نہیں چلا رہا تھا۔ڈرائیور ڈرائیو کر رہا تھا اُس وقت۔

اُسے خود بھی افسوس تھا اِس واقعہ کا۔کوئی بھی جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔اور— ہونی کو

بھی کوئی نہیں ٹال سکتا!

آج کے دن زیب کی آخری کلاس کس وقت ختم ہونی تھی اُسے معلوم تھا۔ سو وہ اُس کے کالج کے گیٹ کے باہر اُس کا انتظار کرنے لگا۔

جوں ہی باہر نکلتے ہوئے وہ بس سٹاپ کے لیے آگے بڑھنے لگی تو قریب چلا آیا۔ اُس کے احتجاج کے باوجود اُسے گاڑی میں بٹھایا۔ اور——

تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ بالکل خاموشی سے۔

ایک نظر زیب پر ڈالی۔ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

اُسے اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔

''میں نے آپ کو اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔۔۔''

اُس نے نوٹ کیا۔ دو دن میں ہی وہ ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ اُس کی آواز جیسے دور سے آ رہی تھی۔ اُس روز اُسے غصے میں 'تم' کہہ کر پکار رہی تھی۔ آج پھر سے 'آپ' کہنے لگی تھی۔ مگر—— اپنے فیصلے پر اب بھی قائم تھی۔

''زیب۔ ہم اِس معاملے پر بات کر سکتے ہیں۔۔۔''

''نہیں۔ آپ مجھے یہیں اُتار دیں۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''پلیز زیب۔'' وہ ملائمت سے بولا۔

''نہیں۔ مجھے اُتار دیں آپ۔''

''یہاں کیسے اُتار دوں؟'' آگے وہ اکیلی کیسے جاتی؟

''میں عادی ہوں اِن راستوں کی۔'' اُس کے لہجے میں طنز گھل مِل گیا۔ سنگین خان کو زیب کے مڈل کلاس کا ہونا یاد دلایا۔

''زیب پلیز! ریلیکس۔''

''میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ "I hate you" ساتھ ہی وہ بے اختیار رو دی۔

''لیکن —— اِس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو گاڑی ڈرائیو بھی نہیں کر رہا تھا اُس وقت۔۔۔''

''آپ نے اُسے آپ کو سی آف کرنے ائیر پورٹ تک جانے کو ہی کیوں کہا تھا؟''

سنگین خان زور سے چونکا۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی۔

''میں نے اُسے مجھے سی آف کرنے ائیر پورٹ تک جانے کو کہا تھا؟'' وہ متحیر سا بولا۔

''اب آپ یہ بھی کہیں گے۔ کہ آپ تو اُسے جانتے ہی نہیں تھے۔۔۔''

''ہاں۔ میں واقعی اُسے جانتا تک نہیں تھا۔۔۔''

''بس۔ پلیز بس۔'' اُس نے اُترنے کو دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ مگر——

سنگین خان گاڑی لاک کر چکا تھا۔

''میری بات سنو۔'' اُس نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ''تمہیں کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔''

''یہی نا۔ کہ آپ اُسے جانتے نہیں تھے۔ اُس نے آپ سے محبت نہیں کی تھی۔ آپ نے اُس کے ساتھ فلرٹ نہیں کیا تھا۔ اُس کے ہوتے ہوئے کسی اور امیر لڑکی سے دوستی نہیں کی تھی۔ اُسے مڈل کلاس کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ طرح طرح سے اُس کا دل نہیں توڑا تھا۔ ائیر پورٹ جاتے ہوئے دس پندرہ منٹ کے ساتھ کی خیرات دینے کو بھی نہیں کہا تھا۔۔۔''

"Hold on, hold on" سنگین خان نے بیچ میں ہی روک دیا۔ ''مجھے اِن میں سے ایک بھی بات کا علم نہیں ہے۔ تمہیں زبردست غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے صرف اِتنا معلوم ہے۔ کہ میں یہاں بابا کے کسی ضروری کام سے آیا تھا۔ رات ہوٹیل میں گزار کر صبح ہی صبح ہوٹیل کی رینٹ کی ہوئی گاڑی میں ائیر پورٹ جا رہا تھا۔ کہ راستے میں ایک لڑکی بس سٹینڈ پر کھڑی نظر آئی۔ اُس نے اِشارے سے ہماری گاڑی روکی۔ پتہ چلا۔ کہ وہ ائیر پورٹ جانا چاہتی تھی۔ اور وہ آل ریڈی لیٹ تھی۔

'کیا آپ لوگ مجھے ائیر پورٹ تک لفٹ دے سکتے ہیں؟' اُس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ وہ خاصی اَپ سیٹ لگ رہی تھی۔

میں پیچھے بیٹھا تھا۔ ڈرائیور نے میری طرف دیکھا۔

'آئیں پلیز!' میں نے کہا۔ اور پچھلی سیٹ سے باہر نکل آیا۔ اُسے بٹھایا۔ اور خود ڈرائیور

کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ہم لوگ بھی چونکہ ایئر پورٹ جا رہے تھے۔ سو اُس کو بھی ساتھ لے چلے۔ فرلانگ بھر اُس دن والی جگہ تک آئے ہی تھے۔ کہ سامنے سے آتے ایک ٹرک کے ساتھ ٹکر ہو گئی اور آگے تمہیں معلوم ہے کہ کیا ہوا؟''

وہ ایک ٹِک اُسے دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی کے عالم میں۔ قریباً ڈیڑھ سال سے جس آدمی سے وہ اَن دیکھے بے تحاشہ نفرت کرتی آئی تھی۔ یہ وہی آدمی تھا یا نہیں؟ وہ مخمصے میں پڑ گئی تھی۔

''میں وہ نہیں ہوں۔ جو تم سمجھ رہی ہو۔ نہ میں کسی زینیہ کو جانتا ہوں۔ مجھے تو اُس کا نام بھی اُس دن تم سے معلوم ہوا ہے۔ تم غصے میں تھیں۔ تو میں یہی سمجھا کہ شاید تم لوگ اُس شخص کو مجرم گردانتے جس کی گاڑی میں ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔۔۔۔ یقین کرو۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ بس ایک لڑکی پریشان کھڑی ایئر پورٹ پہنچنا چاہتی تھی۔ سو لفٹ دے دی۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ وہ ایئر پورٹ پہنچ سکی۔ اور نا ہی میں۔ اُس بیچاری کی ڈیتھ ہو گئی۔ اور میں ہوسپٹل چلا گیا۔ اُس کی ڈیتھ کا مجھے بے حد افسوس تھا۔ لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔۔۔''

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اُس کے چہرے اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ سچائی ڈھونڈنے، حقیقت پانے۔ اور پھر—

Guilt سے پاک اُس کی آنکھوں میں اُسے صداقت نظر آئی، سچ دکھائی دیا۔

''آپ۔۔۔ قسم اُٹھائیں۔'' اُس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھے۔ مزید تصدیق کے لیے کہا۔

''مجھے تمہاری قسم ہے۔'' وہ بولا۔

''بابا کی قسم کھائیں۔'' اپنے بابا سے اُسے بے انتہا محبت تھی۔

''کیوں؟ تمہاری قسم کافی نہیں ہے۔''

''نہیں۔ بابا، بابا ہیں۔'' اُس کے خوبصورت لبوں پر بھی مسکراہٹ چھا گئی۔

اُس نے گہری سانس لی۔

''اوکے میم۔ مجھے بابا کی قسم ہے۔ میں نے تمہیں سب سچ بتایا ہے۔''

سنگین خان کے گھٹنے پر سر رکھتے ہوئے — وہ ایکبار پھر رو دی۔

اب کے سنگین خان کی وجہ سے نہیں — اُسے زینیہ یاد آ گئی تھی۔

سنگین خان تأسف سے اُسے دیکھنے لگا۔ کتنا رو رہی تھی وہ۔ یہ رشتے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ گو اُس کے کوئی بہن یا بھائی نہیں تھا۔ مگر اندازہ تو کر سکتا تھا۔

ویسے—زیب نے تو اُسے کبھی نہیں بتایا تھا۔ کہ اُس کی بہن کسی ایکسیڈنٹ میں ختم ہوئی تھی۔ بہر حال —

اُس نے اُسے رونے دیا۔ کہ اچھا تھا دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

کچھ دیر یوں ہی وہ دل کا غبار نکالتی رہی۔ پھر— آنسو پونچھ لیے۔ سر اٹھا لیا۔

سنگین خان نے گاڑی دوبارہ سٹارٹ کر دی۔ کہ زیب کو زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔

''بہت چاہتی تھی زینیہ اُسے۔'' وہ دھیرے اُسے بتانے لگی۔ ''اُسے معلوم تھا وہ typical امیر زادوں کی طرح شراب اور لڑکیوں کا رسیا تھا۔ اُس سے پہلے بھی اُس کی کئی گرل فرینڈز رہ چکی تھیں۔ پھر— اُس کے ہوتے ہوئے بھی وہ ایک اور لڑکی میں انٹرسٹ لینے لگا تھا۔ اُس کی پرواہ کرنا چھوڑ دی تھی۔ مڈل کلاس کا طعنہ دیا تھا اُسے۔ اِس کے باوجود وہ اپنی محبت سے مجبور اُسی کا دم بھرتی تھی۔ اُس کی بے رُخی کی وجہ سے گھر میں، پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا اُس کا۔ اُداسی چھائی رہتی تھی ہر وقت اُس پر۔ کمہلا کر رہ گئی تھی۔ پھر— اُس سے چند منٹ کی توجہ کی بھیک مانگنے وہ اُس کے کہنے پر اُس کے ساتھ ایئر پورٹ چل دی۔ اور— اُس کے لیے جان دے دی۔ تب میرا دل چاہتا تھا اُسے مار ڈالوں۔ قتل کر دوں اُسے۔۔۔'' وہ ایکبار پھر رونے لگی۔

سنگین خان نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پیار سے اُس کے بال سہلانے لگا۔

''وہ اُس کے ساتھ نہیں۔ میرے ساتھ ایئر پورٹ جا رہی تھی۔۔۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں اُس کی تصحیح کرنے لگا۔

''ہاں۔'' وہ روتے روتے بولی۔ ''اور آج پتہ چلا۔ کہ وہ اُسے پک کرنے ہی نہیں آیا تھا۔ باہر سے ہی چلا گیا تھا۔ اور اب مجھے یہ بھی شک ہو رہا ہے۔ کہ اُس نے نہیں بلکہ زینیہ نے خود ہی اُسے ایئر پورٹ تک ساتھ لینے کو کہا ہوگا۔ چند منٹ ہی سہی وہ اُس کے سامنے تو رہتا۔۔۔'' وہ

سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔

اور — سنگین خان کو پچھلی کئی باتیں یاد آ گئیں۔

''آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ آپ ایلیٹ کلاس سے ہیں۔ اور میں مڈل کلاس بلکہ لوئر مڈل کلاس سے ہوں۔ آپ کو بعد میں معلوم ہو۔ اور آپ مجھے چھوڑ دیں۔ وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ سو بہتر ہوگا۔ آج ہی ہم دونوں اپنے راستے الگ الگ کر لیں۔۔۔'' ایک بار اُس نے کہا تھا۔

''بس۔۔۔ میری بہن کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ وہ بھی کسی امیر لڑکے سے پیار کرتی تھی۔ پھر اُس لڑکے نے کسی امیر لڑکی سے دوستی کر لی تھی۔ میری بہن کو مڈل کلاس کا طعنہ بھی دیا تھا۔۔۔'' یہ بات اُس نے اُسے فون پر کہی تھی۔

''میں۔۔۔ بس جانے ہی والی تھی۔'' شروع شروع میں وہ برائیٹن میں ایک ریسٹورانٹ میں بیٹھی تھی کہ وہ پاس چلا آیا تھا۔ بیٹھا ہی تھا۔ کہ وہ بول پڑی تھی۔

''اتنی دیر جانے کا خیال نہیں آیا۔ میں آ گیا تو جانے کی پڑ گئی۔'' اُس نے کہا تھا۔

پھر — جگہ جگہ، جہاں جہاں بھی وہ ملتی۔ گھبرا جاتی تھی۔ جانے کی کوشش کرتی تھی۔ اُسے سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُس کا وزٹنگ کارڈ نہیں لیا تھا۔ وہیں سیٹ پر چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اُص نے بارہا اپنے لیے longing دیکھی تھی۔ اِس کے باوجود اُس کے قریب آنے سے کتراتی تھی۔ یہی بات اُس نے بابا سے بھی کی تھی۔ کہ یہ تو اُسے یقین ہے کہ وہ اُسے پسند کرتی ہے۔ مگر اِس سے آگے وہ بڑھ نہیں پاتی۔۔۔''

اُس نے گہری سانس لی۔ اُس کے دکھ میں وہ بھی دکھی ہو گیا تھا!

''زیب۔'' اُس نے اُس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ انگلیوں سے اُس کے آنسو پونچھے۔ اُس کی بھیگی متورم آنکھوں پر باری باری پیار کیا۔ ''اب اور نہیں رونا۔ بس'' ایکبار پھر اُس نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ ''اپنے سارے دکھ سارے غم مجھے دیدو۔ تم خوش رہا کرو بس۔ زیبیہ کی اتنی ہی زندگی تھی۔ یہی وقت مقرر تھا۔ خدا پر یقین رکھو۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے۔ اُس میں اُس کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے ہمارے۔ تو پھر اُس سے بڑھ کر کون ہمارا ہمدرد ہوسکتا ہے۔ اور

یہی سوچو۔ کہ ہم سب نے ہی اُسی کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔۔۔''

کتنی اچھی باتیں کرتا تھا وہ۔ اُس نے غور سے سب سنا۔ دل کو بہت ڈھارس ملی۔ سر اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''آپ تو اُس طرح نہیں ہیں نا؟'' وہ شاید مزید تسلی چاہتی تھی۔

اُس نے گہری تھکی سانس لی۔

''ہر آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ نا ہی یہ کلاسز کی بات ہوتی ہے۔ گھر کا ماحول، والدین کی تربیت بھی بہت کاؤنٹ کرتی ہے۔ ہر لڑکی بھی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ یہاں بھی بات کلاس کی نہیں ہے۔ والدین کی تربیت کی ہے۔ میرا یہ خیال ہے۔۔۔'' اپنی آخری بات پر زور دیتے ہوئے وہ مسکرایا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ اُس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ ''بات یقیناً تربیت کی ہے۔ اور۔'' اُس کی حسین بھیگی بھیگی آنکھوں میں شوخی ناچی۔ ''آپ بھی اِس لیے اچھے ہیں۔ کہ بابا نے آپ کی تربیت کی ہے۔ ورنہ۔۔۔'' بابا پر زور دیتے ہوئے اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ورنہ کیا؟''

''یہی کہ آپ بھی مجھے چھوڑ چھاڑ کر کسی اور کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔''

''نہیں میری جان۔ میں ایسا نہیں ہوں۔'' اُس نے متانت سے کہتے ہوئے ایکبار پھر اُسے سینے سے لگا لیا۔ ''میں بچارا تو — پہلی ہی نظر میں غش کھا کر گر پڑا تھا۔۔۔''

زیب بے ساختہ ہنس دی۔

''میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں تمہاری باتیں تمہارا رعب دیکھتے ہی اپنی بالکنی میں گر پڑا تھا۔۔۔''

''اچھا؟ پھر کیا ہوا؟''

''بھلا ہو ندیم کا۔ اُس نے آ کر مجھے اُٹھایا۔ بستر پر ڈالا، عطر سونگھایا۔ تب کہیں جا کر میں ہوش میں آیا۔''

وہ برابر کھلکھلا کر ہنستی رہی۔

''آپ کو پتہ ہے میں آصفہ کو اپنے ساتھ ریسٹورانٹ کیوں لائی تھی؟''

''ٹریٹ مانگ رہی تھی نا وہ ہمارے نکاح کا۔''

''ٹریٹ تو ایک بہانہ تھا۔ وہ واحد گواہ تھی اُس بندے کی جس کے ساتھ ائیر پورٹ جاتے ہوئے زینیہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ خاص طور سے اُسے دیکھنے ہوسپٹل گئی تھی۔ اُس وقت وہ سو رہا تھا۔ اِس لیے آصفہ کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ مگر آصفہ نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ سو۔۔۔''

''اوہ۔ پھر — کیا کہا اُس نے ریسٹورانٹ میں لنچ کے بعد؟''

''صاف مکر گئی تھی۔ کہتی تھی یہ وہ نہیں ہے۔ میں دیکھوں گی اُس کو۔'' وہ مسکراتے بولی۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ زیب کا سراب بھی اپنی گود میں لیے۔

''زیب۔'' اُس نے ہولے سے پکارا۔

''جی۔''

''میں واقعی وہی لڑکا ہوتا۔ تو تم کیا کرتیں؟''

''میں۔۔۔ آپ سے بہت دور چلی جاتی۔۔۔''

''اور — یہ سب تمہیں رخصتی کے بعد پتہ چلتا تو پھر کیا کرتیں؟''

''ایک زندہ لاش بنی آپ کی بیوی ہونے کے فرائض انجام دیتی رہتی۔ اور کیا کرتی۔''

اُس نے چپ چاپ جھکتے ہوئے اُس کے خوبصورت مہکتے بالوں پر پیار کر لیا۔

''میں یہ سب سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پلیز مجھ سے دور جانے کی بات مت کرو۔۔۔'' وہ اَپ سیٹ لگنے لگا تھا۔

اور — وہ اُسے کبھی اَپ سیٹ ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''ایم سوری سنگین۔ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''پرومس؟'' اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''پرومس۔''

چند پل وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

''بائے دا وے — تم مجھے کزن کو دکھانے اُسے ریسٹورانٹ ساتھ لائی تھیں۔'' اُسے اچانک خیال آیا۔ ''اِس کا مطلب ہے۔ تمہیں پہلے بھی شک تھا کہ میں وہی بندہ ہوں۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ یہ اچھی خبر بھی مجھے آپ کی منگیتر نائلہ نے دی تھی۔''

''کیسی خبر؟'' وہ حیرت سے بولا۔

اور — زیب نے اُسے مختصراً بتایا۔ کہ کیسے نائلہ نے اُسے فون کیا تھا۔ اُس پر کیا گزری تھی۔ اور پھر آصفہ نے جب ریسٹورانٹ میں سنگین خان کو دیکھنے کے بعد اُسے بتایا۔ کہ وہ، وہ والا آدمی نہیں تھا۔ تو اُس میں زندگی واپس لوٹ آئی تھی۔ ایکبار پھر وہ جی اٹھی تھی۔۔۔

سنگین خان کچھ نہیں بولا۔ بس — ایک گہری سانس لی۔ جیسے تھک گیا تھا نائلہ کے کرتوت برداشت کرتے کرتے!

وہ چپ چاپ آگے جا رہا تھا۔

''سَر۔'' زیب سیدھی ہو بیٹھی۔ ''میرا گھر قریب آ رہا ہے۔۔۔''

''ہاں۔''

''آپ مجھے گھر سے کچھ دور اتار دیں۔''

''نہیں — اچھا نہیں لگتا۔''

''پھر؟''

''گھر پر ہی چھوڑوں گا۔''

''پلیز! ابو گھر پر ہوئے تو اچھا نہیں سمجھیں گے۔'' ابو کبھی کبھار لنچ پر آ جاتے تھے۔

''اور میں — میں تمہیں یوں اکیلے سٹریٹ میں جاتے ہوئے اچھا نہیں سمجھتا۔۔۔''

''یہ بات ہے؟'' وہ مسکرائی۔

''ہاں۔ اب تم ابو سے زیادہ میری ذمہ داری ہو۔ اُنہیں یہ جان لینا چاہیے۔''

اور — آگے بڑھتے ہوئے وہ اُن کی سٹریٹ میں گاڑی لے گیا۔

اُس کا گیٹ آ گیا۔ تو اُس نے گاڑی روک لی۔

''ایک Kiss دو مجھے۔'' اُس کے اُترنے سے پہلے اُس نے اپنا گال اُس کے آگے

کر دیا۔

''کوئی دیکھ لے گا۔''

''کوئی نہیں دیکھے گا۔'' وہ اب بھی اپنا گال اُس کے آگے کیے تھا۔

زیب نے ہولے سے اپنے ہونٹ اُس کے گال پر رکھ دیئے۔

"Now say you are mine."

"You say it first." جانے کیوں وہ اب بھی اُس سے ہی یقین دہانی چاہتی تھی۔

"I'm yours, I'm all your's." وہ بلا تامل بولا۔

"I'm your's too." وہ دھیرے سے بولی۔ اور——

دروازہ کھولتے ہوئے اُتر گئی۔

''خدا حافظ۔'' سنگین خان بولا۔ اور——

گاڑی ریورس پر لے جانے لگا۔

سہیلیوں کی جھرمٹ میں دلہن بنی زیب خوبصورتی سے آراستہ سٹیج پر بیٹھی تھی۔

جھلمل کرتی روشنیاں تھیں، لہراتے رنگین آنچل تھے۔ پھولوں کی خوشبوئیں تھیں، پرفیومز کی اروما تھی۔

کھنکتی ہنسیاں تھیں، نقرئی قہقہے تھے۔ موج تھا، مستی تھی۔ رونق تھی، ہلچل تھی۔ مگر——

زیب کے قریب بیٹھی آصفہ گم سم تھی۔ چاروں طرف کیا ہو رہا تھا اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بس اتنا معلوم تھا۔ کہ زیب یہاں سے رخصت ہوگی۔ سنگین خان کے یہاں جائے گی۔ اور جلد یا بدیر اُسے یہ معلوم ہوگا۔ کہ وہ وہی آدمی تھا۔ جو بقول زیب کے زینیہ کا قاتل تھا۔ پھر؟ کیا ہوگا؟

کیا ردِعمل ہوگا زیب کا؟ شادی شدہ زندگی سے کیسے سمجھوتہ کر پائے گی؟

خود اُسے کیا کہے گی؟ کیسے معاف کرے گی؟

''آصفہ کیا بات ہے۔ اَپ سیٹ سی ہو۔'' زیب نے دھیرے سے پوچھا۔

وہ رات مہندی پر بھی خاموش خاموش تھی۔ وہ سمجھتی تھی بات کیا تھی؟ اُس نے سنگین خان کی حقیقت اُس سے چھپائی تھی۔ اور اب نتیجتاً کیا ہونا تھا یہ سوچ کر گھبرائی ہوئی تھی۔

زیب کو دل ہی دل میں اُس پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ اچھا تھا تھوڑا وہ بھی پریشان ہولیتی۔ اتنی بڑی بات اُس سے چھپائے بیٹھی تھی۔

وہ جانتی تھی اُس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کہ دوسری صورت میں یا تو زیب نے سنگین خان سے علیحدگی اختیار کرنی تھی اور خدانخواستہ ابو کا ہارٹ فیل ہونا تھا۔ یا پھر ایک چلتی پھرتی لاش بن کر زندگی گزارنے پر مجبور وقت کاٹنا تھا!

''نن۔۔۔نہیں تو۔'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔

''پھر اتنی چپ چپ کیوں ہو؟''

''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ اُس سے نظریں ملائے بغیر بولی۔

اور—زیب کو اُس پر ترس آ گیا۔ کل سے لیکر اب تک وہ اُسے کافی سزا دے چکی تھی۔

''آصفہ۔ وہ وہی ہے۔'' زیب کا لہجہ بہت گھمبیر تھا۔

آصفہ کی جان ہی تو نکل گئی۔ پھیلی پھیلی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''پھر؟'' وہ بمشکل بولی۔

''تم نے مجھ سے بات چھپائی۔۔۔''

آصفہ کے کاٹو تو لہو نہیں تھا بدن میں۔

''وہ۔۔۔میں۔۔۔میں۔۔۔''

''اتنا ڈر کیوں گئی ہو؟'' اپنے ڈرامے پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

آصفہ بیوقوفوں کی طرح اُسے دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔

''میں تمہیں بتانے لگی تھی۔ کہ وہ وہی ہے جو زینیہ کو ایئر پورٹ لیکر جا رہا تھا۔ لیکن۔۔۔ وہ، وہ نہیں ہے جس سے زینیہ پیار کرتی تھی۔۔۔''

Pakistanipoint Waqar Azeem

''کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟''

پھر—زیب نے جلدی جلدی اُسے سنگین خان سے اپنی ملاقات کا سارا حال بتا دیا۔

اور—آصفہ کے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ کچھ اُس کرب پر جس سے وہ اور زیب گزری تھیں۔ اور کچھ اِس بے تحاشہ خوشی پر جو زیب نے پائی تھی۔

دونوں بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ اردگرد سے بے نیاز۔ یہ دیکھے بغیر ہی کہ—

ہال میں موجود مہمان خواتین کی نظریں اُن پر ہی جمی تھیں۔

''مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے زیب یہ سب جان کر۔'' آصفہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

''میں بھی بہت خوش ہوں آصفہ۔'' زیب کی بھی آنکھیں نم تھیں۔

''سنگین خان کو پا کر؟'' آصفہ نے چھیڑا۔

زیب بے اختیار شرما گئی۔ چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔

''ہاں۔ اور وہ جو میں ایک مسلسل کرب میں مبتلا تھی۔ کبھی پل پل سنگین کے بدل جانے کا خوف، کبھی لمحہ لمحہ اپنی مثال دہراتی سامنے کھڑی زینیہ۔ اوہ۔۔۔'' اُس نے سر جھٹکا۔ ''سنگین کے پیار نے خوشیاں تو دی تھیں۔ مگر۔۔۔ بے چینیوں میں پرو پرو کر۔۔۔''

''بس۔ اب کرب ختم ہو گیا۔ پچھلی ساری باتیں ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ خوشی خوشی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ اللہ تمہیں خوشیاں ہی خوشیاں دے۔ اُداسی تمہیں چھو کر بھی نہ گزرے۔۔۔''

''آمین۔'' زیب دھیرے سے بولی۔

''وہ دیکھو۔ تمہارا سنگین خان آ رہا ہے۔'' آصفہ اُس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

زیب کا سر خود بخود جھک گیا۔ خوبصورت پلکوں نے حسین آنکھوں پر چلمن گرا دی۔

اور—سنگین خان اپنے کزنز اور دوستوں کی جلو میں آہستہ آہستہ سٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔